طلوعِ اسلام

اپریل ★ ۱۹۵۳

بیادگارِ اقبال

قیمت فی پرچہ ۰-۱۰-۰

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی)	سعید احمد	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ

جلد ۶	اپریل سنہ ۱۹۵۳ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

باچشم نم	۳	اقبال کی کہانی خود اقبال کی زبانی (محترم پرویز صاحب)	۹-۳۷
لمعات	۵-۱۳	قبرِ اقبال کے پاس (محترم عرشی صاحب)	۳۸-۴۲
ہمارے علمائے کرام	۱۴-۱۵	محبت اور زندگی (جناب حکیم ابوالنظر صاحب رضوی امروہوی)	۴۳-۴۵
عصرِ اقبال (نظم) (محترم اسد ملتانی)	۱۶	مسلمانوں میں سرمایہ داری اور زمینداری کی ابتداء	۴۶-۶۶
قرآنی فیصلے	۱۷	اعجاز القرآن (محترم تمنا عمادی)	۶۷-۷۴
معاملہ کی باتیں	۱۷		
تربتِ اقبال (نظم) (محترم عرشی صاحب)	۱۸		

معراج انسانیت

معارف القرآن - جلد چہارم

ترجمان حقیقت، جناب پرویز کا قلم اور سیرت صاحب قران علیہ التحیہ والسلام، خود قران کے آئینہ میں - فی الحقیقت ہمارے اسلامی لڑیچر میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب - شروع میں قریب ہونے دوسو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے - اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرور کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں - اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں —

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ - جلد مضبوط اور حسین - گردپوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائٹیل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین - قیمت بیس روپے (۲۰) - محصول ڈاک و پیکنگ ایکروپیہ ساڑھے چھ آنے —

نوادرات

مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری

بڑا سائز

ضخامت چارسوصفحات　　قیمت چار روپے　　محصولڈاک نو آنے

ناظم ادارہ طلوع اسلام - کراچی

باچشمِ نم

تحریکِ ختمِ نبوت کے سلسلہ میں سرزمین پنجاب بالخصوص لاہور جن تاسف انگیز حوادث کی آماجگاہ بنے رہی ہے، کونسا قلبِ حساس ہے جو اس پر مضطرب اور کونسی وہ آنکھ ہے جو اس پر خونابہ فشاں نہ ہوگی۔ یہ تحریک اس کے محرکات اور عواقب ایسے ہیں کہ ان پر ٹھنڈے دل سے گفتگو کرنے اور سوچنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہنوز مخاطبین کو وہ سکونِ قلب اور برودتِ دماغ میسر نہیں آسکی جس سے وہ دل کے اطمینان سے ہماری گذارشات پر غور کرسکیں۔ اسلئے ہم نے دل پر جبر کرکے اس حدیثِ دل خراش و جگر سوز کو کسی آئندہ صحبت پر اٹھا رکھنے کا فیصلہ کیا ہے جب فضا پرسکون ہوجائے۔ اِسوقت ہم صرف اتنا عرض کردینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جہاں تک عقیدۂ ختمِ نبوت کا تعلق ہے اسکی پوزیشن یہ ہے کہ جس طرح خدا کو ایک مان لینے کے بعد کسی اور خدا کے وجود کو تسلیم کرنا خدا کے ساتھ شرک ہے اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم . . . . کے بعد کسی شخص کو نبی یا رسول مان لینا شرک فی النبوت ہے جس کا اسلام میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح قرآن خدا کی آخری کتاب ہے جس کے بعد خدا کی طرف سے وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا، اسی طرح رسول اللہ صلعم خدا کے آخری نبی ہیں جن پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ نہ قرآن کے بعد کوئی اور کتاب آسکتی ہے اور نہ رسول اللہؐ کے بعد کوئی اور نبی۔ نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ رسول ہی نبی ہوتا ہے اور نبی ہی رسول ہوتا ہے۔ (تفصیل کیلئے دیکھئے معراجِ انسانیت، باب ختمِ نبوت) قرآن کی رُو سے یہ پوزیشن ایسی واضح ہے کہ اس میں کسی تاویل کی گنجائش ہی نہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اس باب میں میرزا غلام احمد کے متبعین نے جو موقف اختیار کر رکھا ہے اسکی حقیقت کیا ہے اور اس کے ردِ عمل میں جو تحریک شروع ہوئی ہے اس کے پیدا کردہ مسائل کا حل کیا ہے اور حکومت نے یہ رویہ اختیار کیا ہے وہ کس حد تک حق بجانب ہے؟ . . . . تو اس کے متعلق جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں ایک تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے جسے ہم اُسوقت تک ملتوی رکھنا چاہتے ہیں جبتک فضا میں سکون نہ پیدا ہوجائے۔ بایں ہمہ جو مسلمان ان حوادث میں مبتلائے مصائب ہوئے ہیں اور جو ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رخصت بھی ہوگئے ہیں ان کے متعلق سب کچھ کہہ سُن لینے کے بعد یہ حقیقت اپنی جگہ پر باقی رہے گی کہ ان میں یقیناً ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے صدقِ دل سے اپنی جاں سے بے نیاز ہوکر تحفظ ناموس رسالت مآب صلعم کی خاطر عشقِ رسولُ اللہ میں سرشار اپنی جانیں قربان کردیں۔ . . . . اگر (جیسا کہ کہا جاتا ہے) یہ درست ہے کہ بعض لوگوں نے ان مخلص مسلمانوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر انھیں اپنی مفاد پرستیوں کا آلۂ کار بنانے کی کوشش کی تھی تو ایسے لعینِ ازلی جو عشقِ رسول سے بھی دغابازی کرنے میں نہیں شرماتے مستحق ہزار لعنت و نفرین ہیں۔ علیھم لعنۃ اللہ والملٰئکۃ والناس اجمعین۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ان کا جرم ثابت ہوجائے تو انھیں چوراہوں میں پھانسی پر لٹکا دینا چاہیے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لمعات

"یوں تو قصص قرآنی کا ہر ٹکڑا عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے اور جوں جوں نگہ دوررس غور و تدبر سے ان کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے ان کے حقائق و رموز زمانہ کی پیچ در پیچ لہروں کی طرح خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ان قصص میں داستانِ بنی اسرائیل کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس میں قوموں کے عروج و زوال کے اصول و مبادی اس جامعیت سے سمٹا کر رکھ دیئے گئے ہیں کہ وہ بصائر و حکم کی ایک مستقل دنیا بن گئی ہے۔ فسادِ آدمیت کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ تین گوشے نمایاں طور پر ابھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ استبدادِ حکومت کی سرکش طغیانیاں، برہمنیت کی خواب آور و فسوں خیز فریب کاریاں، اور سرمایہ داری کی پرسکون خون آشامیاں۔ ان میں سے ہر ایک فتنہ بجائے خویش انسانیت کا گلا گھونٹ دینے کیلئے کافی ہے۔ لیکن ذرا سوچئے کہ جس دور میں بیک وقت سطحِ ارض پر سبعیت و بربریت کے ایسے ہولناک عفریت، فضا میں تباہی و بربادی کے ایسے ہلاکت انگیز جراثیم اور دریا کی سکون انگیز روانیوں کے نیچے ایسے خوفناک نہنگ و اژدر موجود ہوں، وہاں خدا کی مخلوق پر کیا قیامت گذری ہو گی؟ تاریخ مصر کا یہی دور تھا جس کا تذکرہ قرآن کریم میں اس شرح و بسط سے آیا ہے۔ فرعون، استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ۔ ہامان، برہمنیت کی ابلیسانہ روباہ بازیوں کا پیکر۔ اور قارون، سرمایہ داری کی لعنت کا سب سے بڑا نمائندہ۔ تینوں یکجا۔ اور ان کے آہنی پنجے میں (بنی اسرائیل کی شکل میں) تڑپتی، پھڑکتی، بلبلاتی انسانیت۔ حضرات انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کے جور و استبداد سے چھڑا کر براہِ راست اللہ کے قانون کی اطاعت میں لے آئیں۔" (معارف القرآن جلد سوم ص ۱۸۲)

انسانیت کی پوری تاریخ پر غور کیجئے۔ جس زمانہ میں، جس قوم میں اور جس ملک میں فساد دکھائی دے، تحقیق کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ اس فساد انگیزی میں انہی تین عناصر کا ہاتھ کارفرما ہو گا۔ ملوکیت، سرمایہ داری، اور ملائیت (PRIEST HOOD) زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ یہ ابالیس اپنے پیکر بدلتے رہیں گے، لیکن روح ہر جگہ اور ہمیشہ وہی رہے گی۔ اگر قرآن پر بہ نگاہ تعمق غور کیا جائے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے گی کہ حضرات انبیاء کرام کی دعوت ہمیشہ انہی فساد انگیز عناصر کے خلاف، دعوتِ انقلاب ہوتی تھی۔ وہ لوگوں کو قانونِ خداوندی کے مرکز پر جمع کرتے تاکہ ملوکیت، سرمایہ داری اور ملائیت کے تختوں کو الٹ دیا جائے۔ وہ اس انقلابی کوشش میں ہوتے اور ان کے خلاف یہی قوتیں سرجوڑ کر اٹھ کھڑی ہوتیں تاکہ مظلوم انسانیت ان کے پنجۂ استبداد سے نکلنے نہ پائے۔ امم سابقہ کی داستانیں جو قرآن میں مذکور ہیں اسی کشمکش کی سرگذشت ہیں۔ قرآن خدا کا آخری ضابطہ حیات تھا اور نبی اکرم صلعم خدا کے آخری پیغمبر

اس لئے قرآن کریم کے ذریعہ، نبی اکرم صلعم کے ہاتھوں اس کشمکش کو اس کے آخری مراحل تک پہنچا دیا گیا۔ ملوکیت سرمایہ داری اور ملا ئیت کی ایک ایک قوت کو پاش پاش کر دیا گیا اور انسانیت کو اس حقیقی آزادی اور صحیح حریت سے آشنا کرا دیا گیا جو ضابطۂ خداوندی کا منشا و مقصود تھا۔ یہی تھے وہ سلاسل و اغلال جنہیں توڑنے کیلئے رسول اللہ صلعم تشریف لائے تھے۔ (ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم) آپ نے ان تمام زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آرہی تھی۔

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست نقش ہائے کاہن و پاپا شکست

لیکن یہ دور بہت تھوڑے عرصہ تک قائم رہا۔ اس کے بعد خود مسلمانوں نے ان زنجیروں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو اپنی مژگانِ عقیدت سے ایک ایک کر کے چُنا اور اس طرح اپنے گلے میں ڈال لیا کہ پھر کوئی طاقت انہیں توڑ نہ سکے۔ آسمان کی آنکھ اس تماشا کو دیکھ کر رو رہی تھی کہ اس قوم کو کیا ہو گیا کہ

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

جب ہم اپنی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو فرطِ حیرت سے انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ مسلمان اس (غیر قرآنی تو ایک طرف) غیر انسانی زندگی کا اس درجہ خوگر ہو گیا کہ اسے قفس کو چھوڑ کر آشیانہ کی زندگی موت نظر آنے لگی۔ مورخین اس حیرت انگیز انقلاب کے اسباب و علل تلاش کرتے ہیں لیکن اس کے اسباب تو بالکل نمایاں ہیں۔ مفاد پرست گروہ نے اقتدار کی کرسیوں اور رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ملائیت نے ابلیسانہ نظام کو عینِ اسلام بنانے کے لئے سندات مہیا کر دیں۔ وہ ان کے وظیفے مقرر کر دیتے تھے اور یہ منبروں پر کھڑے ہو کر اپنے خطبات میں انہیں ظل اللہ قرار دے کر ان کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ یہ وہی فرعون و قارون و ہامان کی ملی بھگت تھی جس کا ذکر شروع کے اقتباس میں کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ کے ایسے بندے بھی پیدا ہوتے رہے ہوں جنہوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی ہو لیکن جیسا کہ ہر استبدادی قوت کیا کرتی ہے ان کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ ان کی آواز کو دبا دیا گیا اور ان کے آثار تک کو مٹا دیا گیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ آج ہمارے ہاں ملوکیت اور ملائیت کی تاریخ تو پوری کی پوری موجود ہے لیکن اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا ذکر تک کہیں نہیں ملتا۔ بجز اس کے کہ کہیں اِدھر اُدھر، یہاں وہاں، کوئی بکھری ہوئی پنکھڑی، مَسلی ہوئی مل جائے۔ اس سارے طوفانِ بلا میں اگر کوئی امید کا سہارا تھا تو یہ کہ خدا کی کتاب (غلافوں میں لپٹی ہوئی ہی سہی) محفوظ چلی آرہی تھی۔

یہی تھی خدا کی وہ کتاب جس پر ہمارے دور کے ایک مردِ مسلمان (علامہ اقبالؒ) نے اپنے نالۂ سحری اور گریۂ نیم شبی کے ساتھ غور و فکر کیا۔ تاریخِ عالم کے اوراق، قوموں کے عروج و زوال کے اسباب، اور عصرِ حاضر کے علوم و فنون تک، اسے پوری پوری دسترس تھی۔ وہ اس پورے سرمایہ کو لیکر قرآن کی گہرائیوں میں اترا، اور وہاں سے اس حقیقت کو پا کر باہر آیا کہ مسلمان کی یہ حالت کیوں ہو گئی۔ یہ وہی حقیقت تھی جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ مسلمان کی یہ حالت اس لئے ہوئی ہے کہ

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر سود خوار و والی و ملا و پیر۔

اس نے مسلمان سے برملا کہہ دیا کہ

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری   اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

اس نے اپنی تمام عمر، فسادِ آدمیت کے انہی گوشوں کے خلاف جہاد میں بسر کردی اور اسی غم میں روتے روتے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو یہاں سے چلدیا اور اب عالمگیر کی مسجد کے زیرِ سایۂ دیوار، آسودۂ خواب ہے۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اس نے مسلمان کو بتایا کہ ملوکیت کا فتنہ کس قدر غارت گیرِ دین و دانش ہے اور اس کے ماتحت کس طرح انسانی سیرتیں مسخ ہو جاتی ہیں۔ اس نے کہا کہ

از ملوکیت نگہ گردد دگر   عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دِگر

اس نے کہا کہ جس جگہ ملوکیت ہو، وہاں حق کا جھنڈا کبھی بلند نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مسلمانوں کو کبھی اپنے آپ کو اس فریب میں نہیں رکھنا چاہئے کہ ہماری سلطنتیں اسلام کی سلطنتیں تھیں اور ان کا نظام قرآن کا نظام تھا۔ اس نے کہا کہ

رایتِ حق از ملوک آمد نگوں   قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں

ارمغانِ حجاز میں اقبال نے خلافت اور ملوکیت کے فرق کو ایک قطعہ میں اپنے دلکش انداز میں واضح کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ

خلافت بر مقامِ ما گواہی است   حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ   خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

"حفظِ ناموسِ الٰہی" کے معنی یہ ہیں کہ خلافت، ضابطۂ خداوندی، یعنی قرآنی نظام کی عملی تشکیل کی ذمہ دار ہوتی ہے اور اس طرح اس کے ہاتھوں دنیا میں ناموسِ خداوندی کا تحفظ ہو جاتا ہے۔ اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ملوکیت کے معنی صرف اسی قدر نہیں کہ باپ کے بعد بیٹا وارثِ تخت و تاج ہو جاتا ہے۔ قرآن (اور اقبال) کے نزدیک ملوکیت ہر اس نظام کا نام ہے جس میں غیر قرآنی قوانین رائج ہوں، خواہ اس کی شکل پادشاہی کی ہو یا جمہوریت کی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو   جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

دنیا نے، زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر (کہ جو درحقیقت خدا کے کائناتی قانون کے تقاضے ہیں) اتنی چیز کو تو تسلیم کر لیا ہے کہ باپ کے بعد بیٹا وارثِ تخت و تاج نہیں ہو سکتا، لیکن چونکہ ان کے پاس خدا کا ضابطۂ قوانین نہیں ہے اسلئے ان کی حالت اب بھی یہ ہے کہ

رست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر

وہ اب یہ سمجھتے ہیں کہ انسانوں کی ایک جماعت (اکثریت) کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کے قوانین چاہے مرتب کر لے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ برسرِ اقتدار طبقہ اس قسم کے قوانین وضع کرتا رہتا ہے جن سے دولت کے سرچشمے ان کے ہاتھ میں رہتے ہیں اور وہ اسی

سرمایہ داری سے وہ کچھ کرتے ہیں جو کچھ شخصی حکومت میں ایک بادشاہ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے برعکس، قرآن جہاں ملوکیت کو تباہ کرتا ہے وہاں سرمایہ داری کو بھی فنا کر دیتا ہے۔ بقول اقبالؒ

چیست قرآں، خواجہ را پیغامِ مرگ	دست گیرِ بندۂ بے ساز و برگ

ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو	لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا

اقبالؒ واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ سرمایہ داری، زمینداری اور جاگیر داری درحقیقت آئین و دستور ملوکیت ہی کی شاخیں ہیں۔ اور شجرۃ الزقوم کی ان شاخوں کا بھی وہی پھل ہے جو خود ملوکیت کا۔ یعنی

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک	دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک

یہی وجہ ہے کہ قرآن جہاں جمع کردہ دولت کو جہنم کا ایندھن قرار دیکر آئین سرمایہ داری کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے، وہاں وہ یہ حکم دیکر کہ وسائل پیداوار (ارض) کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں دیئے جاسکتے، زمینداری یا جاگیرداری کے نظام کہن پر بھی خط تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔ یہی ہے وہ حقیقت جس کا اقبالؒ نے بارہا اعلان کیا ہے کہ

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت	ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

دہ خدایا نکتۂ از من پذیر	رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

حتیٰ کہ اس نے بالکل کھلے ہوئے الفاظ میں کہدیا کہ

باطنِ "الارض للہ" ظاہر است	ہرکہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

ذرا آگے چل کر اسی (جاوید نامہ) میں کہتے ہیں کہ

رزق خود را از زمیں بُردن رواست	ایں متاعِ بندہ و ملکِ خدا ست

ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو	چیست شرحِ آیۂ لا تفسدوا

ابنِ آدم دل بہ ابلیسی نہاد	من ز ابلیسی نہ دیدم جز فساد

اس مقام پر انھوں نے پھر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ خلافت اور سلطنت میں یہی فرق نہیں کہ خلیفہ منتخب ہوتا ہے اور سلطان اپنی سلطنت کو وراثت میں پاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اصل فرق یہ ہے کہ

مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو	ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

لیکن اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی نے اس حقیقت کو بھی بھانپ لیا تھا کہ ملوکیت، سرمایہ داری، زمینداری کی لعنتیں جس قوت کے سہارے پنپتی اور پروان چڑھتی ہیں وہ ملائیت کی بنیادی لعنت ہے۔ ہر شخص جو ذرا عقل و فکر سے کام لے، بآسانی محسوس کر لیتا ہے کہ ملوکیت سرمایہ داری اور زمینداری یکسر غیر فطری نظام زندگی ہیں۔ لیکن جب مُلا اُسے یہ بتاتا ہے کہ یہ سب کچھ خدا اور رسول کے حکم کے مطابق ہے اور ان سے انکار کرنے والا خدا کا سرکش، اور ذات رسالت کا منکر، تو وہ بیچارہ خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مُلا آگے بڑھتا ہے اور

کہتا ہے کہ شریعت میں عقل کا کوئی دخل نہیں۔ اگر کسی کے دل میں "خدا اور رسولؐ" کا حکم سننے کے بعد ذرا سا شک و شبہ بھی پیدا ہو جائے تو وہ سیدھا جہنم میں جا گرتا ہے۔ اس پر بیچارہ سادہ لوح مسلمان کانپ اٹھتا ہے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ دین کی مصلحتیں خدا اور اس کا رسول ہی جان سکتے ہیں، ہمارا کام ایمان لانا ہے اور بس۔ حالانکہ جس چیز کو ملا خدا اور رسول کے احکام بتا کر پیش کرتا ہے وہ اسی نظام سرمایہ داری کے وضع کردہ آئین ہوتے ہیں اور جن سے انکار کرنے والوں پر وہ "منکرین حدیث" کا لیبل لگا کر انھیں گلی کوچے میں بدنام کرتا رہتا ہے کہ یہ ایک "نیا اسلام" لیکر آگئے ہیں، یہ خدا کے احکام کے نافرمان بردار ہیں۔ یہ رسول کی شانِ رسالت کے منکر ہیں۔ یہ اسلاف کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ ملوکیت اور سرمایہ پرستی کے زمانے کے پیدا کردہ احکام، خدا اور رسول کے احکام نہیں۔ لیکن مُلّا کا تو منصب ہی یہ ہے کہ وہ انہی احکام کو خدا اور رسول کے احکام بتا کر عوام کو فریب میں رکھے۔ یہ ہے وہ سب سے بڑا سحر جس کے سہارے ملوکیت اور سرمایہ داری کا نظام قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان "علمبرداران مذہب و شریعت" کی اس شدت سے مخالفت کی ہے۔ اور یہی وجہ ہو کہ اقبال بھی عمر بھر اسی فتنۂ ملت بیضا کے خلاف جہاد کرتا رہا۔ کہیں اس نے کہا کہ

متاعِ شیخ اساطیر کہن بود	حدیث او ہمہ تخمین و ظن بود
ہنوز اسلامِ او زنار دار است	حرم چوں دیر بود او برہمن بود

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے ان سادہ اور مختصر سے الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جس چیز کا نام مُلّا نے خدا اور رسول کا حکم رکھ چھوڑا ہے وہ درحقیقت اس کا خود ساختہ مذہب ہے جسے اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کا عجمی اسلام زنارپوش ہے اور یہ اس اسلام کا برہمن۔ اسے کچھ معلوم نہیں کہ حقیقی اسلام کیا ہے۔

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را	بیفشاں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند	کہ مُلّا کم شناسد رمزِ دیں را

وہ کہتا ہے کہ قرآن تو اپنے الفاظ میں محفوظ ہے لیکن مُلّا اس قرآن کی تفسیر اپنے خود ساختہ تصورات کے مطابق کرتا ہے اور اس طرح قرآن، قرآن نہیں رہتا بلکہ عجمی مجوسیوں کی کتاب بن جاتا ہے۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر	تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پا زند

اسی حقیقت کو وہ "ارمغانِ حجاز" میں اس انداز میں بیان کرتا ہے کہ

ز من بر صوفی و مُلّا سلامے	کہ پیغام خدا گفتند ما را
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت	خدا و جبرئیلؑ و مصطفٰیؐ را

یعنی مُلّا، قرآن کے الفاظ تو وہی دہراتا ہے جنھیں خدا تعالیٰ نے بھیجا، جبرئیلؑ لایا اور رسول اللہؐ نے لوگوں تک پہنچایا۔ لیکن اس قرآن کا جو مفہوم بتاتا ہے اسے دیکھ کر خدا، جبرئیلؑ، اور محمد صلعم تینوں محوِ حیرت رہ جاتے ہیں کہ یہ کونسا قرآن ہے جسے اس طرح بیان کیا جا رہا ہے۔ قرآن کا وہ مفہوم جس کے متعلق اکبر الہ آبادی نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا ہے کہ

مری قرآں دانی پر نہ ہو جئے تم خفا صاحب مجھے تفسیر بھی آتی ہے، اپنا مدعا کہئے

مُلّا کا یہی وہ خود ساختہ مذہب ہے جس نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن برق قوم کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہی ہے وہ حقیقت جس کے احساس سے اقبال کہتا ہے کہ

مکتب و مُلّا سخن ہا ساختند مومناں ایں نکتہ را نشناختند

زندہ قوے بود از تاویل مُرد آتشِ او در ضمیرِ او فسُرد

بظاہر مُلّا کی باتیں سنئے تو ایسا نظر آئے گا کہ دین کی حفاظت کا درد اُسے کھائے جا رہا ہے لیکن اگر اس کے دل کو ٹٹول کر دیکھئے تو اس میں سوائے مصلحت بینی اور مفاد پرستی کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ خدا، رسول، قرآں، احادیث، اسلاف، مذہب، شریعت، وہ حسین اور مقدس نقاب ہیں جن کی اوٹ میں یہ انہی مفاد پرستیوں کو آگے بڑھاتا رہتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

دلِ مُلّا گرفتار غمے نیست نگاہے ہست در چشمش نمے نیست

ازاں بگریختم از مکتب او کہ در ریگِ حجازش زمزمے نیست

اس کی مفاد پرستیوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ ملت کو کبھی ایک نقطہ پر جمع نہ ہونے دے۔ فرقہ بندی (کہ جسے قرآن نے بنص صریح شرک قرار دیا ہے) اس کے اسلام کی اصل و بنیاد ہے۔ فرقہ بندی کی نفسیات یہ ہیں کہ فرقہ کے لوگوں کے دل میں دوسروں کی طرف سے نفرت پیدا کی جائے۔ جسقدر نفرت شدید ہوگی اتنا ہی وہ فرقہ زیادہ مضبوط ہوگا۔ مُلّا کی ساری عمر نفرت کے جذبات کو ہوا دینے میں گذر جاتی ہے۔

سر منبر کلامش نیش دار است کہ او را صد کتاب اندر کنار است

حضورِ تو من از خجلت نہ گفتم زخود پنہاں و بر ما آشکار است

اسی حقیقت کو اقبالؒ نے جاوید نامہ میں سعید حلیم پاشا کی زبان سے یوں بیان کیا ہے۔

دین حق از کافری رسواتر است زانکہ ملا مومنِ کافر گر است

شبنم ما در نگاہِ مایم است از نگاہ او یم ما شبنم است

اس دوسرے شعر پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ کیا مُلّا کی ساری عمر اسی "جہاد" میں نہیں گذر جاتی کہ وہ اپنے اور اپنے حواریوں کے سوا سارے مسلمانوں کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھے، ان کی ہنسی اُڑائے، انھیں ذلیل سمجھے، اور اپنے آپ کو صالحین میں شمار کرے۔ ان کے متعلق وہ یہاں تک بھی کہدے کہ

ان کے برائے نام مسلمان رہنے سے اسلام کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں بلکہ سراسر نقصان ہے۔

(تنقیحات ابوالاعلیٰ مودودی ص۱۷۲)

مسلمانوں کے متعلق یہ کچھ اسوقت کہا جا رہا تھا جب ہندوستان میں مسلمان موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ہندو کی پوری کوشش تھی کہ سارے ہندوستان پر اپنا قبضہ جما کر مسلمان کے جداگانہ تشخص کو ختم کر دے۔ اس کے خلاف تحریک پاکستان کے حامیوں کی کوشش تھی کہ ایک

جداگانہ خطہ زمین مل جائے جو مسلمانوں کے تحفظ کا ذریعہ بن جائے۔ عین اس کشمکش کے زمانے میں مُلّا کی طرف سے یہ آوازیں بلند ہو رہی تھیں کہ یہ تحریک سراسر خلاف اسلام ہے۔ مردم شماری کے رجسٹر کا یہ "پیدائشی مسلمان" باقی رہے یا مٹ جائے۔ اس سے اسلام کا کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ تھے وہ تاثرات جن کے ماتحت اُس مردِ مومن نے با چشم نم کہا تھا کہ

شبنم ما در نگاہِ مایم است	از نگاہ او یم ما شبنم است

اس کے بعد اقبال سعید حلیم پاشا کی زبان سے کہتا ہے کہ

از شگرفی ہائے آں قرآں فروش	دیدہ ام روح الامیں را در خروش
زاں سوئے گردوں دِلش بیگانۂ	نزد او ام الکتاب افسانۂ

ملّا کی قرآں فروشی کی داستانوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ لیکن ماضی میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آج اپنے سامنے دیکھ لیجئے کہ مُلّا کس جرأت اور بے باکی سے قرآن بیچ رہا ہے۔ غور کیجئے! خود پاکستان میں کتنے ایسے ملّا ہیں جن کا بظاہر کوئی ذریعۂ معاش نہیں لیکن جن کے پاس کوٹھیاں ہیں، موٹریں ہیں، ٹیلیفون ہیں، عیش و عشرت کے سامان ہیں۔ ملّا کا گروہ دن اور رات چلاتا نظر آئیگا کہ حکومت کے کارندے بے ایمان ہیں، بددیانت ہیں، رشوت خوار ہیں، ان کی تنخواہیں قلیل ہیں، لیکن ان کے پاس جائدادیں کثیر ہیں۔ لیکن آپ نے آج تک کبھی کسی ملّا کو یہ کہتے نہیں سنا ہوگا کہ فلاں مولوی صاحب کو دیکھئے کہ ان کا کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں (یا اگر ہے تو بہت قلیل ہے) لیکن وہ جائدادیں بنوا رہے ہیں، ہزاروں روپئے ماہانہ کا خرچ ہو رہا ہے۔ اس ٹھاٹ سے زندگی بسر ہو رہی ہے۔ ذرا معلوم کرنا چاہئے کہ یا آخر یہ روپیہ کہاں سے آرہا ہے۔ مُلّا کی نگاہ کبھی ان کی طرف نہیں اٹھتی۔ کیوں اُٹھے۔ یہ تو صالحین کا گروہ ہے۔ یہ "شھداء علی الناس" کی جماعت ہے ان کا کام دوسروں کے اعمال کی نگرانی ہے۔ اپنے گروہ سے متعلق لب کشائی نہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حمام میں سب ننگے ہیں۔ یہ ملّا کے عمل کی کیفیت ہے اور علم کی یہ حقیقت کہ

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبی	آسمانش تیرہ از بے کوکبی
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد	ملت از قال اقولش فرد فرد

اس کے بعد وہ دو شعر سنئے جن میں اقبال نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے جب کہا ہے کہ

مکتب و مُلّا و اسرار کتاب	کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب
دین کافر فکر و تدبیر جہاد	دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

شعر نہیں۔ ایک چیخ ہے جو دل کی گہرائیوں سے اٹھی ہے اور بے ساختہ زبان سے نکل کر آسمان سے جا ٹکرائی ہے۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ اسی عنوان کی تفسیر ہے کہ

"دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد"

یہ تھا حقیقت میں ابلیس کا وہ سب سے زیادہ موثر حربہ جو اس نے ملتِ اسلامیہ کے خلاف استعمال کیا۔ اسی حقیقت کو جاوید نامہ

میں ابلیس کی زبان سے یوں ادا کیا گیا ہے کہ۔

نے حدیث و نے کتاب آوردہ ام — جانِ شیریں از فقیہاں بردہ ام
رشتۂ دیں چوں فقیہاں کس نہ رشت — کعبہ را کردند آخر خشت خشت

مُلّا کے اس مسلک فساد انگیزی، نفرت خیزی، اور فتنہ جوئی کو اقبالؒ نے ذرا شوخ انداز میں (بالِ جبریل میں) اس طرح بیان کیا ہے۔

ہیں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا — حق سے جب حضرتِ مُلّا کو ملا حکمِ بہشت!
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف — خوش نہ آئیں گے اسے حور و شرابِ لب کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال اقول! — بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت!
ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا — اور جنّت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت!

اقبالؒ نے اس حقیقت کو اچھی طرح سے سمجھ لیا تھا کہ مُلّا کے اس جذام کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ عوام کو مُلّا کے ہاتھ سے چھڑا لیا جائے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسلمانوں کے عوام کے دل میں بڑا خلوص ہے اور وہ ہر ممکن قربانی کیلئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اس کے الفاظ میں

خیر و خوبی بر خواص آمد حرام — دیدہ ام صدق و صفا را در عوام

اس نے اسے بھی محسوس کیا کہ عوام بڑے سادہ لوح ہیں اور مُلّا انھیں مذہب کے نام پر ابھار کر اپنی مفاد پرستیوں کا آلۂ کار بنا لیتا ہے۔ یہی تھی وہ حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ

شیخ شہر از رشتۂ تسبیح صد مومن بدام

اس کا علاج اس کے نزدیک اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں قرآن کے نظام کو از سرِ نو قائم کیا جائے۔ جونہی وہ نظام قائم ہو گیا ملوکیت، سرمایہ داری اور ملائیت خود بخود فنا ہو جائے گی کہ

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خدا است — چوں یکے اندر قیام آئی فنا است

یہ تھا وہ مقصدِ جلیلہ جس کے لئے اس مردِ خدا اندیش نے پاکستان کا تصور دیا، یہ خطۂ زمین مل بھی گیا لیکن اس وقت جب اقبال یہاں سے جا چکا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہی جذام جسے دور کرنے کے لئے اس نے اس خطۂ زمین کے لئے دعائیں مانگی تھیں چاروں طرف سے امنڈ کر اسی خطۂ زمین میں جمع ہو گیا۔ اور آج حالت یہ ہے کہ

زاغوں کے تصرف میں ہے شاہیں کا نشیمن

کتنا حسین تھا وہ خواب اور کسقدر بھیانک ہے اس کی یہ تعبیر۔ اگر چند سے ہی کیفیت اور رہی، تو کچھ بعید نہیں کہ یہ خواب پھر سے خوابِ پریشاں بن جائے۔

کے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے — فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

لیکن جب تک قرآن باقی ہے ہمارے لئے مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔

محفل ما بے مئے و بے ساقی است ساز قرآں را نوا ہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر آسماں دارد ہزاراں زخمہ در
ذکر حق از امتاں آمد غنی از زمان و از مکاں آمد غنی
حق اگر از پیش ما بردارد ش پیش قومے دیگرے بگذاردش

ایسے وقت میں اتنا صدمہ ضرور ہوگا کہ

ترسم از روزے کہ محرومش کنند آتش خود بردلے دیگر زنند

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (۵/۵۴)

اے ایمان والو! جو تم میں سے نظام خداوندی سے روگردانی اختیار کرے گا تو اس قوم کی جگہ اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو لے آئیگا جو نظام خداوندی سے محبت رکھے گی اور وہ نظام اس قوم کو اپنے لئے خوش آئند پائے گا۔ اس قوم کے افراد کی خصوصیات یہ ہونگی کہ ان لوگوں کے مقابلے میں نہایت نرم اور جھکے ہوئے رہیں گے جو اس نظام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں (جو مومن ہوں) لیکن مخالفین کے مقابلے میں بڑے سخت ہوں گے۔ وہ اس نظام خداوندی کے قیام و بقا کے لئے جان تک لڑا دیں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ وہ فضل ایزدی ہے جو ہر اس قوم کے نصیب ہو سکتا ہے جو اسے حاصل کرنا چاہے۔ یاد رکھو۔ اللہ کا قانون زندگی کی خوش حالیوں اور کشادگیوں کا حامل ہے اور ہر قوم کے اعمال سے باخبر۔

رابطۂ باہمی

تفصیل کیلئے گذشتہ پرچوں کا نوٹ دیکھئے۔

تحصیل چکوال (جہلم) — انور بیگ ولد جمعدار رحمت خاں۔ محلہ نکہ۔ مقام وڈاکخانہ بھون۔ تحصیل چکوال۔ ضلع جہلم
سرگودھا ——— خلافت علی فاروقی صاحب ہیڈ کلرک سرگودھا امپرومنٹ ٹرسٹ۔ میونسپل گارڈن۔ سرگودھا۔
کویت (پرشین گلف) — چوہدری محمد صادق صاحب ایس بی ۱۷/۲ سی اینڈ ایم بی احمدی۔ کویت۔ (پرشین گلف)
رحیم یار خاں (بہاولپور) — غلام کبریا ملک۔ معرفت سید ذاکر حسین صاحب ایڈووکیٹ۔ رحیم یار خاں
ملتان ——— ماسٹر غلام احمد صاحب ٹیلر۔ صدر بازار۔ ملتان چھاؤنی۔

ہمارے علمائے کرام

سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

آپ کے ہاں امامت کا معیار حد سے زیادہ پست ہو چکا ہے۔ جو منصب مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں سب سے زیادہ اہم تھا وہ اب سب سے زیادہ غیر اہم ہے۔ جس منصب کیلئے بہتر سے بہتر آدمی منتخب کرنے کا حکم تھا اب اس کیلئے بدتر سے بدتر آدمی چھانٹا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ذہن میں اب امام کا تصور یہ ہے کہ جو شخص دنیا کے کسی اور کام کا نہ ہو اسکو مسجد کا امام ہونا چاہیے دس پانچ روپیہ تنخواہ اور دو وقت کی روٹی مقرر کر دی اور کسی نیم خواندہ ملا کو رکھ لیا۔ یہ گویا مسجد کی امامت کا انتظام ہو گیا۔ امامت کو اس درجہ پست کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری مسجدیں، وہی مسجدیں جنھوں نے کبھی ہماری قوم کے قصرِ فلک بوس کی تعمیر کی تھی، آج ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو بے علم، تنگ نظر، پست حوصلہ اور دنی الاخلاق ہیں۔ کیا۔ آپ ان لوگوں سے امید رکھتے ہیں کہ یہ اردو میں خطبے دیکر آپ کی دینی و دنیوی رہنمائی کر سکیں گے؟

اس گروہ کو چھوڑ کر اگر آپ نے جمعہ کی امامت کیلئے کسی دوسرے گروہ کا انتخاب کرنا چاہا تو لامحالہ اس کیلئے آپ کو علماء ہی کے طبقے کی طرف رجوع کرنا ہو گا اور باستثنائے[1] چند اس طبقے کے سوادِ اعظم کا جو حال ہے اسے بیان کرنا گویا اپنی ٹانگ کھولنا اور آپ ہی لاجوں مرنا ہے۔ ان حضرات کو اگر آپ نے عام فہم زبان میں من ملنے خطبے دینے کا موقع دیا تو یقین جانیئے کہ آئے دن مسجدوں میں سر پھٹول ہو گی۔ اسلئے کہ ان میں کا ہر شخص اپنا ایک الگ مشرب رکھتا ہے اور اپنے مشرب میں وہ اتنا سخت ہے کہ دوسرے مشرب والوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا اس کے نزدیک گناہ سے کم نہیں۔ پھر اللہ نے اس کی زبان میں ایک ڈنک رکھ دیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کئے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتا۔ وہ جس ماحول کے تعلیم و تربیت پا کر آتا ہے اور جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے وہاں دین کے مہمات اور قوم کے مصالح کیلئے کوئی جگہ نہیں۔ تمام دلچسپیاں سمٹ کر چند چھوٹی چھوٹی نزاعی باتوں میں جمع ہو گئی ہیں۔ اس لئے لامحالہ وہ جب زبان کھولے گا انہی مسائل پر کھولیگا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ کے گھر میں گالم گلوج اور جوتی پیزار ہو گی اور آخر کار ہر مشرب کے مسلمان اپنے جمعے الگ الگ قائم کرنے لگیں گے۔ یہ تو مذہبی ذہنیت رکھنے والوں کا حال ہوا۔ رہے نئے تعلیم یافتہ حضرات جو ان مسائل سے دلچسپی نہیں رکھتے تو ان پر ایک دوسری مصیبت نازل ہو گی۔ وہ ہر جمعہ کو رسول اللہ کے منبر پر سے وہ وہ موضوع اور ضعیف روایتیں اور لاطائل کہانیاں اور احکامِ اسلامی کی غلط تعبیریں سنیں گے کہ جن کو سن کر غیر مسلموں کا مسلمان ہونا تو درکنار، ذی ہوش مسلمانوں کا مسلمان رہنا بھی مشکل ہو۔

مذہبی دھڑے بندیوں کے علاوہ اب مسلمانوں میں سیاسی دھڑے بندی کا بھی زور ہو رہا ہے۔ جہاں کہیں مولوی قسم کے مسٹروں یا مسٹر قسم کے مولویوں کو امامت و خطابت کا موقع مل گیا ہے وہاں وہ نہایت ہی بے سمٹ اور بے لگام طریقے سے اپنے سیاسی مسلک کی تائید اور مسلک مخالف کے لوگوں کی تذلیل و تضحیک و تفسیق کرنے لگے ہیں۔ یہ ایک اور فتنہ ہے جو اگر کچھ زیادہ بڑھ گیا تو مسلمانوں کیلئے مل کر نماز پڑھنا بھی مشکل ہو جائیگا۔ مسجدوں میں وہ کچھ ہونے لگے گا جو پولنگ اسٹیشنوں پر ہوا کرتا ہے! اور بالآخر ہر سیاسی مسلک کے لوگوں کی مسجدیں الگ ہو کر رہیں گی۔ (تفہیمات حصہ دوم۔ صفحہ ۲۵۸ - ۲۵۹)

---

[1] بریلوی اپنے اور اپنے ہم نواؤں کے لئے اس قسم کی گنجائش رکھ لیتا ہے۔ طلوعِ اسلام

علماء کی عام حالت یہ ہے کہ وہ زمانے کے موجودہ رجحانات اور ذہنیتوں کی نئی ساخت کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اسلام سے بیگانہ کر رہی ہیں ان پر اظہار نفرت تو آپ جتنا چاہے کرا لیجئے۔ لیکن اس زہر کا تریاق بہم پہنچانے کی زحمت وہ نہیں اٹھا سکتے۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لئے جو پیچیدہ علمی اور عملی مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے۔ اسلئے کہ ان مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں۔ اور اجتہاد کو یہ اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو بیان کرنیکا جو طریقہ آج ہمارے علماء اختیار کر رہے ہیں وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنے کے بجائے الٹا متنفر کر دیتا ہے اور بسا اوقات ان کے مواعظ سن کر یا ان کی تحریریں کو پڑھ کر بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے کسی غیر مسلم یا بھٹکے ہوئے مسلمان کے چشم و گوش تک یہ صدائے بے ہنگام نہ پہنچی ہو۔ (تنقیحات ص ۳۸)

انیسویں صدی کے آغاز میں سلطان سلیم نے اس کمزوری کو محسوس کیا اور انتظام سلطنت کی اصلاح، علوم جدیدہ کی اشاعت، طرز جدید پر عسکری تنظیم اور جدید مغربی آلات حرب کی ترویج شروع کی۔ لیکن جاہل صوفیوں اور تنگ نظر علماء سے تجدید کے علم اور اسکی روح سے قطعاً بے بہرہ تھے، مذہب کے نام پر اصلاحات کی مخالفت کی۔ یورپین طرز پر فوج کی تنظیم کو بے دینی سے تعبیر کیا۔ جدید فوجی وردیوں کو تشبہ بالنصاریٰ قرار دیا۔ سنگین تک کے استعمال کی اسلئے مخالفت کی گئی کہ کافروں کے اسلحہ استعمال کرنا ان کے نزدیک گناہ تھا۔ سلیم کے خلاف یہ کہکر نفرت پھیلائی گئی کہ وہ کفار کے طریقے رائج کر کے اسلام کو خراب کر رہا ہے۔ شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی نے فتویٰ دیا کہ ایسا بادشاہ جو قرآن کے خلاف عمل کرتا ہو بادشاہی کے لائق نہیں۔ آخر کار ۱۸۰۷ء میں سلیم کو معزول کر دیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مذہبی پیشواؤں نے اپنی جہالت اور تاریک خیالی سے اسلام کے مانع ترقی ہونے کا غلط تخیل پیدا کیا۔

زمانے کے حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے دوسرے مسلمانوں کی نسبت ترکوں پر ان تغیرات کا زیادہ اثر پڑ رہا تھا وہ یورپ کے مقابلے میں بالکل سینہ بسینہ کھڑے تھے اور برسر پیکار تھے۔ مغربی قوموں کے ساتھ ان کے سیاسی، تمدنی اور تجارتی تعلقات نہایت گہرے تھے اور خود انکی ماتحت یورپین اور عیسائی قومیں سرعت کے ساتھ مغرب کے اثرات قبول کر رہی تھیں مگر ترکوں کے مذہبی پیشواؤں نے جو تفقہ اور اجتہاد سے بالکل عاری اور اسلام کی حقیقی تعلیمات سے قطعاً ناواقف تھے، ان تغیرات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور ترکی قوم کو مجبور کیا کہ سات سو برس قبل کی فضا سے ایک قدم آگے نہ بڑھیں۔ سلیم کے بعد محمود نے اصلاح کی کوششیں کیں اور علماء و مشائخ نے پھر مخالفت کی۔ بڑی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد ۱۸۲۶ء میں محمود اس قابل ہو سکا کہ جدید عسکری تنظیم کو رائج کر سکے مگر علماء اور درویش برابر یہی تبلیغ کرتے رہے کہ یہ اصلاحات بدعت ہیں، ان سے اسلام کو خراب کیا جا رہا ہے، سلطان بے دین ہو گیا ہے اور طرز جدید کی فوج میں بھرتی ہونا مسلمانوں کیلئے خرابی ایمان کا موجب ہے۔ (تنقیحات ص ۹۶-۹۷)

ایک طرف ترکی قوم میں اتنے بڑے انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی، دوسری طرف ترکوں کے علماء اور مشائخ تھے جو اب بھی ساتویں صدی کی فضاؤں سے نکلنے پر آمادہ نہ تھے۔ انکے جمود، ان کی تاریک خیالی، ان کی رجعت پسندی اور زمانے کے ساتھ حرکت کرنے سے انکے قطعی انکار کا اب بھی وہی حال تھا جو سلطان سلیم کے زمانہ میں تھا۔ وہ اب بھی کہہ رہے تھے کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، حالانکہ ان کی آنکھوں کے سامنے الحاد کا دروازہ کھل رہا تھا۔ وہ ابھی تک فلسفہ و کلام کی وہی کتابیں پڑھنے پڑھانے میں مشغول تھے جن کو پھینک کر زمانہ پانچ سو برس آگے نکل چکا تھا۔ وہ اب بھی اپنے وعظوں میں قرآن کی وہی تفسیریں اور وہی ضعیف حدیثیں سنا رہے تھے جن کو سن کر سو برس پہلے تک کے لوگ تو سر دھنتے تھے مگر آج کل کے دماغ ان کو سن کر صرف ان مفسرین و محدثین ہی سے نہیں بلکہ خود قرآن و حدیث سے بھی منحرف ہو جاتے ہیں وہ ابھی تک اصرار کر رہے تھے کہ ترکی قوم میں وہی فقہی قوانین نافذ کئے جائیں جو شامی اور کنز الدقائق میں لکھے ہوئے ہیں خواہ اس اصرار کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ ترک ان قوانین کے اتباع سے بھی آزاد ہو جائیں جو قرآن اور سنت رسول میں مقرر کئے گئے ہیں۔ (تنقیحات ص ۱۰۷)

(مغلوں کے زمانے میں) عام طور پر جو حالت طبقہ متوسط کی تھی وہی علماء کی بھی تھی، ان میں بیشتر وظیفہ خوار تھے۔ کسی نہ کسی بادشاہ یا امیر یا درباری سے وابستہ ہو جانا۔ اس کے وظیفے کھا کر اس کی منشا کے مطابق دین اور دینی قوانین کی تعبیر کرنا، اپنے ذاتی مفاد کو دین کے تقاضوں پر مقدم رکھنا۔ . . . ان کا شعار تھا۔ (ترجمان القرآن [illegible])

طلوع اسلام - ہر مولوی یہ کچھ کہہ کر آخر میں یہ کہتا ہے کہ دوسرے مولوی اس قسم کے ہیں۔ میں اور میرے حواری ایسے نہیں۔ ہم صالحین کا گروہ ہیں۔ یخدعون اللہ والذین آمنوا۔

عصرِ اقبال

قول یہ اقبال کا تھا "شاعرِ فردا" ہوں میں
اس سبب سے انجمن کے درمیاں تنہا ہوں میں

بس کہ پُرتاثیر تھی اس کی صدائے دردناک
"بُلبلِ تنہا" کے نالوں سے ہوئے دل چاک چاک

زندگی میں کارگر ہونے لگا اُس کا پیام
بعدِ رحلت اور بھی روشن ہوا اُس کا کلام

معترف سب حکمتِ اقبال کے ہونے لگے
مشرق و مغرب میں اس کے ترجمے ہونے لگے

بہرہ یاب اُس کے سخن سے ہو رہے ہیں آج سب
ترکی و شام و عراق و مصر و ایران و عرب

رات دن اس کی نواؤں سے فضا معمور ہے
اُس کے نغمے نشر کرنے پر ہوا مجبور ہے

آگیا ہے عالمِ افکار میں اک زلزلہ
کروٹیں لینے لگا ہے زندگی کا ولولہ

ہے جو تحریک اتحادِ عالمِ اسلام کی
یہ بھی اک تشکیل ہے اقبال کے پیغام کی

عالمِ اسلام کے فکر و نظر پر چھا گیا
وقت کے افکار پر اقبال غالب آگیا

خُلدِ نو میں سب سے اونچا قصر ہے اقبال کا
حق تو یہ ہے عصرِ حاضر عصر ہے اقبال کا

اسد ملتانی

قرآنی فیصلے

گذشتہ اشاعت میں اپنی زیر ترتیب کتاب "قرآنی فیصلے" کے متعلق اعلان کیا گیا تھا۔ اس اعلان میں اگرچہ ہم نے فہرست عنوانات بھی شائع کردی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعض حضرات اس کے متعلق ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے سمجھا ہے کہ یہ کتاب احکام القرآن کی قسم کی تصنیف ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ گذشتہ پانچ برس میں قارئین طلوع اسلام نے ہمارے پاس مختلف استفسارات بھیجے ہیں جو مع ان کے جوابات کے طلوع اسلام میں شائع ہوتے رہے۔ اب قارئین کے تقاضے پر ان تمام استفسارات اور جوابات کو نئی ترتیب کے ساتھ یکجا شائع کیا جارہا ہے چونکہ ہمارے جوابات قرآن ہی کی روشنی میں دیئے جاتے ہیں اسلئے اس کتاب کا نام "قرآنی فیصلے" تجویز کیا گیا تھا لیکن چونکہ بعض حضرات کو اس نام سے کچھ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے اسلئے مناسب سمجھا گیا ہے کہ اس کا نام

"قرآن کی روشنی میں فیصلے"

رہنے دیا جائے۔ جن احباب نے ہمیں فرمائشیں بھیجی ہیں وہ اگر ان میں کوئی تبدیلی چاہتے ہوں تو ہمیں مطلع فرمادیں۔

معاملہ کی باتیں

ان تمام امور کی سختی سے پابندی کیجئے

(۱) خط وکتابت میں اپنے نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجئے ورنہ عدم تعمیل کی شکایت نہ فرمائیے ـــــ (۲) جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ یا لفافہ بھیجئے ـــــ (۳) رسالہ ہر ماہ پانچ تاریخ کو حوالۂ ڈاک کردیا جاتا ہے۔ اگر آپ کو بروقت پرچہ نہیں ملا تو سمجھ لیجئے کہ آپ کا پرچہ محکمہ ڈاک کی غفلت سے ضائع ہوگیا اسلئے پندرہ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیجئے ـــــ (۴) ڈاکخانہ کی طرف سے رسالہ کی روانگی کیلئے ۵، ۱۰، ۲۰، ۳۰ تاریخیں مقرر ہیں، ان تاریخوں کے علاوہ ہم دوسری کسی تاریخ میں پرچہ نہیں بھیج سکتے اگر آپ نے دفتر کو کوئی شکایت تحریر فرمائی ہے تو تعمیل کیلئے ان تاریخوں کا انتظار فرمائیے ـــــ (۵) آپ کا چندہ ختم ہوگیا ہے تو دفتر سے آپ کو ایک جوابی کارڈ بھیجا گیا ہے اس کا فوری جواب دیجئے۔ اگر آپ جواب نہیں دے رہے تو آئندہ پرچہ آپ کی خدمت وی پی حاضر ہوگا جس کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہے ـــــ (۶) ادارہ طلوع اسلام ایک تبلیغی ادارہ ہے وی پی منگا کر واپس کردینا اخلاقی جرم کے علاوہ ایک تبلیغی ادارہ کو نقصان بھی پہنچانا ہے ـــــ (۷) اگر آپ رسالہ کے ایجنٹ ہیں اور آپ رسالہ کی ایجنسی جاری رکھنا نہیں چاہتے تو ۲۵ تاریخ سے پہلے پہلے ادارہ کو اطلاع دیجئے اور بلاوجہ ادارہ کو نقصان نہ پہنچائیے۔

منیجر ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

تربتِ اقبال

رہ نوردے فارغ از ہنگامہ شد — معتکف بر تربتِ علامہ شد
با تب و تاب و گداز و درد و سوز — روز و شب می خواند "اسرار و رموز"
شرحِ الفاظ و معانی می نمود — نکتۂ از علمِ او پنہاں نبود
یکشبے خوابِ گراں ہوشش ربود — چشم زیں سو بستہ و آں سو کشود
اجتماعے دید در خلدِ بریں — صدرِ محفل رحمۃ للعالمیں
آمد اقبال و فغانے ساز کرد
نعرہ زد، نالہ آغاز کرد

کاے ظلامِ دہر را نورِ مبیں — عشقِ تو سرمایۂ جانِ حزیں
گر قیامت سر برآری از زمیں — ایں قیامت درمیانِ خلق بیں
روحِ پیغامِ مرا نشناختند — پیکرم را صورتِ بُت ساختند
شعرِ من خوانند و جوشند، آہ آہ — استخوانم می فروشند آہ آہ
من سراغِ منزلم، منزل نیم — زورقِ ایں قوم را ساحل نیم
گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام
شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام"

مصطفیٰ از سوزِ دل آہے کشید — چشم وا کرد و سوئے اقبال دید
گفت مسلم را ز من پیغام دہ! — تشنہ را از کوثرم ایں جام دہ!
عصرِ حاضر فتنہ ہا اندر بر است — شش جہت معمورۂ شور و شر است
قلعۂ محفوظ قرآن است و بس — رشدِ او ہا وائے انسان است و بس
جاہل است از حکمتش ملا و پیر — غافل است از صولتش میر و وزیر
از تحزب بر جمالش صد نقاب — ابرہا مقنع بروئے آفتاب
باز گیر از حجرہ و از خانقاہ — تا درخشد دہر ازیں نور الٰہ
"گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن"

(عرشی)

اقبالؔ کی کہانی خود اقبالؔ کی زبانی

[محترم پرویز صاحب نے بتقریب یوم اقبال ۱۹۵۱ء عنوانِ بالا پر ایک تقریر کی تھی جس کے نوٹس اس وقت لے لئے گئے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس موضوع کو اور پھیلا کر تفصیلی کہانی مرتب کر لی جائے جو سیرتِ اقبال کے مختلف گوشوں کو محیط ہو اور ان کی فکر کے متنوع دائروں کو اپنے آغوش میں لے لے۔ لیکن ان کی گوناگوں مصروفیات اس میں مانع رہیں۔ اب اس خیال سے کہ جتنا کچھ انھوں نے اس تقریر میں کہا تھا کہیں وہ بھی ذہن سے نہ اتر جائے، انھوں نے ہماری درخواست پر اپنی نوٹس سے یہ تقریر مرتب فرما دی ہے جسے بسرت شائع کیا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ یہ کہانی سوانحعمری نہیں ہے جس میں ترتیبِ واقعات کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ یہ صرف اقبال کے قلب و دماغ کی مختلف کیفیتوں کا مطالعہ ہے جسے زمان و مکان کی قیود سے الگ ہٹ کر پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس "کہانی" کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھئے۔ طلوعِ اسلام]

برادرانِ عزیز!

علامہ اقبالؒ نے اپنے آخری کلام ارمغانِ حجاز میں کہا ہے کہ

چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک ہمہ گفتند باما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

جب کیفیت یہ ہے کہ خود اقبالؔ کے اپنے اندازے کے مطابق، کوئی شخص اقبال کی حقیقت سے کماحقہٗ واقف نہیں ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حقیقی اقبال کی جھلک دیکھی کہاں سے جائے؟ اس سوال کا جواب چنداں مشکل نہیں۔ اسلئے کہ اقبال خود اپنے متعلق اتنا کچھ کہہ گیا ہے کہ اس سے اقبالؔ کی پوری تصویر نگہِ تجسس کے سامنے آجاتی ہے۔ میرے لئے یہ تو مشکل ہے کہ اس مختصر سے وقت میں اس تصویر کے تمام گوشوں کی تفاصیل آپ کے لئے جنتِ نگاہ بنا سکوں۔ اس وقت صرف اتنا ہو سکے گا کہ اس کے ابھرے ہوئے نقش و نگار اور نمایاں خط و خال سامنے لائے جا سکیں۔ اس مرقعِ نگہ تاب اور پیکرِ خوش انداز کی تفصیلی گل کاریوں اور جلوہ طرازیوں کو میں نے اپنی اُس تالیف کے لئے اٹھا رکھا ہے جو "پیامِ اقبال اور قرآن کریم" کے عنوان سے میرے پیشِ نظر ہے اور جسے میں، حضرت علامہ کے ان احساناتِ عظیم کے زیرِ احساس، جن سے میری نگہِ تشکر ہمیشہ نگوں سار رہے، اپنے ذمہ ایک قرض سمجھتا ہوں۔ خدا مجھے اس قرضِ حسنہ سے سبکدوش

ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اس وقت میری دوسری مشکل یہ ہے کہ حضرت علامہ کے کلام کا بیشتر حصہ فارسی میں ہے اور اس قسم کا مخلوط مجمع فارسی زبان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مجھے مجبوراً ان کے اردو کلام ہی پر اکتفا کرنا ہوگا اور فارسی اشعار صرف ان مقامات پر پیش کئے جائیں گے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔

انیسویں صدی کے آخر شب کے ستارے جھلملا رہے ہیں اور بیسویں صدی کی نازنینۂ سحر انگڑائیاں لے رہی ہے۔ قلب، زندہ دلانِ پنجاب، یعنی لاہور، کی کیف بار فضائیں، شباب و شعر کی نکہتوں اور رنگ و نظر کی نزہتوں سے دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کا منظر پیش کر رہی ہیں۔ گورنمنٹ کالج کی درسگاہ اپنے معیارِ تعلیم کی بلندی کے ساتھ ساتھ دولت مند خاندانوں کے عشرت پسند نونہالوں کی لاابالیوں کے لئے دور دور تک شہرت حاصل کر چکی ہے۔ کہتے ہیں سیالکوٹ کے ایک متوسط خاندان کا نہایت ذہین طالب العلم اس حیرت کدۂ علم و تماشا میں آ نکلتا ہے۔ شروع شروع میں جہاں وہ نوجوان اس فضا کو اپنے لئے غیر مانوس پاتا ہے، وہاں خود وہ فضا بھی اس نووارد کو اجنبی سا محسوس کرتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ نووارد طالب علم اپنی سحر طرازیوں سے اس پوری فضا پر چھا جاتا ہے اور جس محفل میں شریک ہو جاتا ہے اسے تبسم فشاں و قہقہہ بار بنا دیتا ہے۔ تعلیمی منازل میں اس کا یہ عالم ہے کہ اساتذہ اس کا معلم کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ دوستوں کی مجلس میں یہ کیفیت ہے کہ ہر شخص اس سے قریب تر ہونے میں ایک خاص نشاطِ روح محسوس کرتا ہے۔ اس کی شرکت سے شعر و سخن کی محفلوں میں ایک تازہ حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ محسوس ہونے لگ جاتا ہے کہ اس سے پیشتر لاہور محض ایک پیکرِ آب و گل تھا اور اس میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ پہلے پہل ابھی مسکرائی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نوجوان کی حالت یہ ہے کہ وہ اس محفلِ طرب و نشاط کے کسی ساز کو اپنا ہم آہنگ اور اس گلکدۂ حسن و تماشا کے کسی پھول کو اپنا ہم رنگ نہیں دیکھتا۔ اسے ہر ایک اپنا ہمنوا اور ہم ذوق سمجھتا ہے لیکن وہ کسی کو بھی اپنا ہم صفیر و ہم نگاہ نہیں پاتا۔ اس کی شرکت سے اجڑی ہوئی محفلوں پر بھی بہار آ جاتی ہے۔ لیکن یہ بھری محفلوں میں بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی شے کی جستجو ہے جس نے اسے سراپا اضطراب بنا رکھا ہے۔ کوئی خلشِ تجسس ہے جو اسے کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی۔ وہ اپنی تشنگیٔ ذوق کی تسکین کے لئے ہر دور سے نظر آنے والے چشمہ کی طرف لپکتا ہے لیکن اسے سراب پا کر مضطرب و بیقرار واپس آ جاتا ہے۔ وہ کبھی اسی تسکینِ خاطر کے لئے لارنس گارڈن میں جا نکلتا ہے لیکن اس جہانِ رنگ و بو کی جمال افروز شادابی و شگفتگی بھی اس کے لئے جاذبِ نگاہ نہیں بنتی۔ وہ ایک حسین شاخ پر چہچہانے والے "گلِ رنگین" کو نہایت غور سے دیکھتا ہے اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ

تو شاسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں — اے گلِ رنگین ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیبِ محفل ہے، شریکِ شورشِ محفل نہیں — یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں
اس چمن میں، میں سراپا سوز و سازِ آرزو

اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

سوز بانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے   راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے
میری صورت تو بھی اک برگِ ریاضِ طور ہے   میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے

مطمئن ہے تو پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

ہو سکتا تھا کہ وہ اس خلشِ پیہم اور سوزِ مسلسل کے ہاتھوں تنگ آ کر اپنی زندگی کا رخ بدل لے لیکن کوئی بے صوت صدا ہے جو چپکے ہی چپکے اس کے کان میں کہہ دیتی ہے اور وہ خود ہی پکار اٹھتا ہے کہ نہیں! مجھے گھبرانا نہیں چاہئے. کہیں

یہ پریشانی مری سامانِ جمعیت نہ ہو؟   یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو؟
ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوت نہ ہو؟   رشکِ جامِ جم مرا آئینۂ حیرت نہ ہو؟

یہ تلاشِ متصل، شمعِ جہاں افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

یہ تسکین اسے پھر آمادۂ تجسس کر دیتی اور وہ ہلاکِ ذوقِ جستجو پھر اسی تپش و خلش کے لئے سیماب پا ہو جاتا. جب اس سے پوچھا جاتا کہ بالآخر اس سوزِ پیہم اور خلشِ مسلسل کی وجہ کیا ہے؟ ہر شخص نے اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصود متعین کر رکھا ہے اور اس کا دل اس سے مطمئن ہے لیکن ایک تم ہو کہ تمہیں کسی پہلو قرار ہی نہیں. کوندے کی لپک کی طرح یہاں سے وہاں، اور شعلے کی تڑپ کی طرح وہاں سے یہاں. وہ سب کچھ سنتا اور ایک آہ بھر کر کہہ دیتا کہ

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد   دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے   تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے   سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایت آں کہ نہایتے ندارد   بہ نگاہِ ناشکیبے، بدلِ امیدوارے

اس کی فطرت کی یہی سیمابیت اور ذوقِ جستجو کی اضطرابیت تھی جو اسے ہر مقام میں دیوانہ وار لئے پھرتی تھی. کبھی حکمت و فلسفہ کی خشک گھاٹیوں میں، کبھی شعر و ادب کی شاداب وادیوں میں، کبھی مسجد و خانقاہ کی خلوتوں میں اور کبھی محفلِ رنگ و چنگ کی جلوتوں میں. اور یہ سب کچھ اس بے باکانہ اعتراف کے ساتھ کہ

مدتے با لالہ رویاں ساختم   عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم   بر چراغِ عافیت داماں زدم

چنانچہ اس کی یہ ہرزہ نوردی اور ہر منزل نشینی کی کیفیت جسے قرآن نے فی کل وادٍ یہیمون کی شاعرانہ نفسیاتی کیفیت سے تعبیر کیا ہے،

دیکھنے والوں کے دل میں اس کے متعلق عجیب وغریب خیالات پیدا کیا کرتی۔ اسی کیفیت کو ایک مولوی صاحب کی زبان سے سنئے جو اس زمانہ میں اقبال کی ہمسائیگی میں رہتے تھے۔ اقبال کے الفاظ میں

حضرت نے میرے ایک شناسا سے یہ پوچھا — اقبال کہ ہے قمری شمشاد معانی
پابندیٔ احکام شریعت میں ہے کیسا؟ — گو شعر میں ہے رشکِ حکیم ہمدانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل — مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اُڑانی
کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے — عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پُرانی
گاتا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت — اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سُنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے — بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی

اس شہر میں جو بات ہوا ڑ جاتی ہے سب میں — میں نے بھی سُنی اپنے اجتا کی زبانی
اک دن جو سرِ راہ ملے حضرت زاہد — پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پُرانی
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے — یہ آپ کا حق تھا زرہِ قرب مکانی
گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت — پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا — گہرا ہے میرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں — کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

واعظ کو اس قسم کے مسلک سے وجہ شکایت بجا تھی لیکن حیرت تو یہ ہے کہ اس باب میں رندانِ میکدہ بھی کچھ کم گلہ طراز نہ تھے۔ ان کی بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اقبال ہے کیا؟ وہ بھی یہ کہتے تھے کہ

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو — رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے، تنہا بھی ہے
عین شغلِ مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز — کچھ ترے مسلک میں رنگِ مشربِ مینا بھی ہے
ہے حسینوں میں وفا ناآشنا تیرا خطاب — اے ستم کیش! تو مشہور رہی رسوا بھی ہے

لے کے آیا ہے جہاں میں عادتِ سیماب تو
تیری بے تابی کے صدقے، ہے عجب بیتاب تو

یہ سُنکر اقبال مسکراتا اور کہتا کہ

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے — مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں
آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے — مضطرب ہوں، دل سکوں ناآشنا رکھتا ہوں میں
فیضِ ساقی شبنم آسا، ظرفِ دل دریا طلب — تشنہ دائم ہوں، آتش زیرِ پا رکھتا ہوں میں

خلشِ آرزو سے اقبال کی یہ آشفتگی روز بروز بڑھتی گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے سینۂ شعلہ ساماں و آذر فشاں میں جو حشر بپا ہو رہا ہے اسے اپنے ہم جلیس احباب کو کس طرح دکھائے! یہی وجہ تھی کہ وہ بھری محفل میں بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا تھا اور یہ تنہائی اسے رہ رہ کر ستاتی تھی، حتیٰ کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزہ جینے میں — کچھ مزہ ہے تو اسی خونِ جگر پینے میں
کتنے بیتاب ہیں جوہر میرے آئینے میں — کس قدر جلوے تڑپتے ہیں میرے سینے میں
اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہیں وہ لالے ہی نہیں

اُسے تلاش تھی کسی ایسے محرمِ راز کی جو اس کی سنتا اور اسے سمجھتا لیکن اسے کہیں ایسا رفیقِ ہم نوا نہیں ملتا تھا حتیٰ کہ وہ اپنی تلاش میں تھک کر کہہ اٹھتا کہ

یہاں کہاں ہم نفسِ میسر، یہ دیس نا آشنا ہے اے دل — وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیرِ چرخِ کہن نہیں ہے

اُسے اس تنہائی کا احساس آخر تک رہا۔ اس لئے کہ وہ جس دیس کی بولی بولتا تھا اسے سمجھنے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ اسلئے وہ ہر راہرو سے کہتا کہ

غریب شہر ہوں میں، سن تو لے مری فریاد — کہ تیرے سینے میں بھی ہوں قیامتیں آباد
میری نوائے غم آلود ہے متاعِ عزیز — جہاں میں عام نہیں دولتِ دلِ ناشاد
گلہ ہے مجھ کو زمانے کی کور ذوقی سے — سمجھتا ہے میری محنت کو محنتِ فرہاد
صدائے تیشہ کہ بر سنگ می خورد دگر است
خبر بگیر کہ آوازِ تیشہ و جگر است

یہ تنہائی بعض اوقات اسقدر شدت اختیار کر جاتی کہ وہ سمجھتا کہ وہ کسی اور دنیا کا انسان ہے جو بھولے بھٹکے یہاں چلا آیا ہے۔ وہ راتوں کی تنہائیوں میں اٹھ اٹھ کر روتا اور خدا سے کہتا کہ

دریں میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر — کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

لیکن اس تنہائی کے باوجود کسی فردوسِ گم گشتہ کی تلاش تھی جو اسے ہر وقت گوشہ بگوشہ لئے پھرتی تھی۔ تلاشِ حقیقت کی یہی خلش بے پایاں تھی جو اسے دانشکدۂ فرنگ میں لے گئی۔ وہاں پہنچکر ایک اور کشمکش شروع ہو گئی یا یوں کہئے کہ اس کی دیرینہ کشمکش کی نوعیت متعین ہو گئی۔ اقبال کی کیفیت یہ تھی کہ ابتدائی تعلیم و تربیت کے اثر سے ایمان اس کے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا تھا۔

اُس کے تحت الشعور میں اِس کے نقوش بہت گہرے تھے۔ لیکن دماغی طور پر وہ ابھی تک یکسر فلسفی تھا۔ فلسفہ سے اسے شغف بھی خاص تھا۔ مغرب میں پہنچے تو وہاں کے فلاسفرز کی صحبت اور تعلیم نے اس شغف کو اور گہرا کر دیا۔ لیکن اس سے ہوا یہ کہ جو کچھ قلب کی گہرائیوں میں بلا دلیل و برہان جاگزیں تھا فلسفہ اس کی تائید نہیں کرتا تھا۔ اور جو کچھ فلسفیانہ دلائل و براہین سے ثابت ہوتا تھا، اس کی گواہی دل نہیں دیتا تھا۔ دل اور دماغ کی یہی وہ کشمکش تھی جو آگے چل کر مشرق و مغرب کی کشمکش کے نام سے ابھری۔ یہی وہ کشمکش ہے جو اقبال کے سارے پیغام میں مختلف اصطلاحات سے سامنے آتی ہے۔ عقل اور عشق، دل اور دماغ، خرد و جنوں، علم و حضور، خبر و نظر، ذکر و فکر، رازی و رومی، ابلیس و جبریل، مصطفیٰ و بولہب، اہرمن و یزداں۔ یہ سب تقابل درحقیقت ادراک و جذبات کی اس کشمکش کے مظہر تھے۔ مغرب میں میکانکی تصورِ حیات نے انسان کو ایک پیکرِ آب و گِل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دی تھی۔ اس تصور کی رُو سے زندگی مادی تبدیلیوں سے وجود میں آجاتی تھی اور انہی اجزا کے پریشان ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ اس کے برعکس، ایمانی تصورِ حیات کی رو سے حیاتِ انسانی کا سرچشمہ مادہ سے ماورا تھا، اور موت اس کی آخری حد نہیں تھی بلکہ زندگی کی جوئے نغمہ خواں اس کے بعد بھی مسلسل رواں دواں رہتی تھی۔ مغربی سائنس کی رو سے علم کا دائرہ محسوسات کی چار دیواری تک محدود تھا۔ اس کے برعکس، ایمانیات کی رو سے علم حقیقی کا سرچشمہ وحی تھا جو سرحدِ ادراک سے ماورا تھا۔ مغربی معاشرے کی بنیادیں، تنہا عقل پر استوار تھیں جس کا تقاضا ہر فرد کے اپنے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، ایمانیات کی رو سے معاشرہ کی اساس، ان مستقل اقدار پر رکھی جاتی تھی جو تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر نفع و نقصان اور خیر و شر کی میزان ہوتی ہیں۔ عقل کا تقاضا دوسروں کا سب کچھ چھین کر اپنا آپ بنانا تھا لیکن عشق کا تقاضا، دوسروں کی ربوبیت سے اپنے نشوونما کا سامان بہم پہنچانا تھا۔ عقل انسانی زندگی کو سمٹا کر انفرادی دائرہ میں محبوس کر دیتی تھی۔ عشق اسے پھیلا کر ساری دنیا پر محیط کر دیتا تھا۔ عقل خود بین تھی، عشق جہاں بین۔ عقل من و تو کے امتیاز سے درخت کو شاخوں اور پتوں میں منقسم دیکھتی تھی۔ عشق کو ہر ذرہ میں آفتاب پنہاں نظر آتا تھا۔ عقل محوِ تماشائے لبِ بام رہتی تھی، عشق، آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑنے کا متقاضی تھا۔ عقل بوالہبی حیلہ جوئیاں سکھاتی تھی اور عشق روحِ مصطفویؐ کا پیامبر تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

عقل و عشق کی یہی کشمکش تھی جس نے دانشکدۂ مغرب میں اقبال کے سینے کو وقفِ اضطراب کر دیا اور اس سے دن کا چین اور رات کا آرام چھین لیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

یہی وہ دور تھا جس کے متعلق وہ بہت بعد میں کہا کرتے تھے کہ

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں کہاں حضور کی لذت، کہاں حجابِ دلیل

اقبال کی زندگی میں یہ مقام بڑا مشکل اور یہ دوراہہ بڑا فیصلہ کن تھا۔ اگر اس کش مکش میں دماغ، دل پر غالب آجاتا۔ اگر مملکتِ عشق میں عقل کی حکمرانی ہو جاتی۔ اگر فلسفہ کی دلیلیں، ایمان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتیں۔ اگر زندگی کی سوداگرانہ مصلحت کوشیاں متاعِ فقر و قلندری کو

خرید لیتیں۔ تو اس کے بعد نہ صرف یہ کہ اقبالؔ اقبالؔ نہ ہوتا، بلکہ نہ دنیا کے نقشہ پر پاکستان کا وجود ہوتا اور نہ ہم آپ آج عشق و محبت کے ان جگر سوز افسانوں کو اس طرح دہراتے۔ نہ ملتِ اسلامیہ ہندیہ کا اپنا کوئی منفرد مقام ہوتا اور نہ آج یہاں ایمان و قرآن کے انسانیت ساز تصورات کے چرچے ہوتے۔ اس نازک وقت میں خود اقبال پر کیا گذر رہی تھی اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس پر کبھی یہ کیفیات خود وارد ہوئی ہوں۔ جب عقل و حکمت کی فسوں سازیاں، اس کے لئے فریبِ نگاہ بننے کی کوشش کرتیں تو عشق و مستی کی رندانہ جرأت فرمائیاں، عروسِ حقیقت کے حسین چہرے سے ذرا نقاب سرکا دیتیں۔ وہ حقیقت کی اس ایک چھنتی جھلک سے، فریبِ عقل سے جھنجھلا کر منہ موڑ لیتا اور تڑپ و درد میں ڈوبی ہوئی نوائے جگر گداز سے کہتا کہ

الٰہی عقلِ خجستہ پا کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے — اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے

اور کبھی بیتاب ہو کر دعائیں مانگتا کہ

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر — شریکِ زمرۂ لا یحزنون کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں — میرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

مبداءِ فطرت کا یہ انداز عجیب ہے کہ جب تلاشِ حقیقت کی تڑپ و خلش انتہائی شدت اختیار کر لیتی ہے تو حقیقت اپنے چہرے سے خود آپ نقاب اٹھا دیتی ہے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں نبی اکرمؐ سے فرمایا گیا کہ ووجدک ضالاً فھدیٰ۔ "ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو منزلِ حیات کی طرف راہنمائی کر دی"۔ چنانچہ جو شخص بھی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتا ہے فطرت کا غیر مرئی ہاتھ اس کی راہ نمائی کر دیتا ہے۔ عام انسانوں کی صورت میں یہ راہ نمائی سبل (یعنی پگڈنڈیوں) کی طرف ہوتی ہے۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (۲۹/۶۹) لیکن رسول کی راہنمائی صراطِ مستقیم یعنی زندگی کی متوازن شاہراہ کی طرف ہوتی ہے۔ پگڈنڈیوں پر چلنے والے اگر اپنا رخ اس صراطِ مستقیم کی طرف کر لیں جس پر رسول گامزن ہوتا ہے تو ان کی پگڈنڈیاں بھی اسی شاہراہِ حیات سے مل جاتی ہیں۔ ورنہ ان کا کاروانِ حیات فضائے عقل و خرد کے پیچ و خم میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب تلاشِ حقیقت میں قلبِ اقبال کی تپش و خلش بھی شدت تک پہنچ گئی تو اس فیصلہ کن لمحہ میں مبداءِ فیض کی کرم گستری سے اس کا قدم صحیح راستہ کی طرف اٹھ گیا۔ جب عقل کی شر انگیزیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر کر کہا کہ اس طلسمِ پیچ و تاب سے نکلنے کی راہ کونسی ہے تو وہ گھبرایا۔ لیکن ایک ثانیہ میں اس کا دلِ پرسوز پکار اٹھا کہ

چارہ ایں است کہ از عشق گشادے طلبیم — پیشِ او سجدہ گذاریم و مرادے طلبیم

اس جواب سے اقبال کا وہ قلبِ بیتاب جو اس کشمکشِ خرد و جنوں سے سراپا اضطراب بن رہا تھا ایمان و یقین کی طمانیت بخش آسودگی سے قرار و سکون کی جنت بن گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کی یاد میں وہ اس کیف و مستی سے پکار اٹھتا تھا کہ

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے — خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل[1] مجھے

---

[1] عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس سے اقبال کا اشارہ کسی اور طرف ہے لیکن جہاں تک میرے مضمون کا تعلق ہے۔
غواص کو مطلب ہے گہر سے، نہ صدف سے

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں — اہلِ گلشن پر گراں میری غزلخوانی نہیں
قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی — دل کے مٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی
ضو سے اُس خورشید کی اختر میرا تابندہ ہے — چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے

یک نظر کردی و آدابِ فنا آموختی
اے خنک روزے کہ خاشاکِ مرا در سوختی

اس سے اقبال کے دل کو کس قدر یکسوئی نصیب ہوگئی اس کی خفیف سی جھلک اس نے اپنی اس نظم میں دکھائی ہے جو "حسن و عشق" کے عنوان سے بانگِ درا میں شامل ہے۔ مضمون کے علاوہ اس نظم میں حسنِ شعریت، تراکیب کی ندرت، تشبیہات کی موزونیت، اور استعارات کی برجستگی دیکھئے اور پھر اندازہ لگائیے کہ ابتدا ہی سے فطرت نے اس حقائق شناس قلب کو اسلوب بیان بھی کس قدر حسین و دلکش عطا فرمایا تھا۔ (یہ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیانی دور کی نظموں میں سے ہے) کہتے ہیں۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیِ سیمین قمر — نورِ خورشید کے طوفاں میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا آنچل لیکر — چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم — موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم

ہے ترے سیلِ محبت میں یونہی دل میرا

ہے میرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار — میرے بیتاب تخیل کو دیا تو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں — نئے جوہر ہوئے پیدا میرے آئینے میں
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال — تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال

قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا

یہ عشق کی پہلی منزل تھی جس میں قرار و سکون ہی مدعائے حیات سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے بعد وہ منزل آئی جس میں شورش و حرارت مقصودِ کائنات نظر آتا ہے۔ عشق کی ان بلا انگیز شورشوں میں وہ لذت تھی کہ اقبال اس حظ و کیف کے لئے قدم قدم پر ھل من مزید کی دعائیں کرتا اور عجیب رقص و مستی میں پکار اٹھتا تھا کہ

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر — ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں — یا تو خود آشکار ہو، یا مجھے آشکار کر

جب اقبال کو اس کشمکشِ پیہم سے اس طرح فراغ نصیب ہو گیا تو اس نے عقل و خرد کے اس تمام دفترِ بے معنی پر جو اپنے آپ کو وجہِ قیامِ کائنات سمجھے ہوئے تھا، ایک تبسم ریز نگاہ ڈالی اور اس سے اپنے مخصوص انداز میں کہدیا کہ

تیری متاعِ حیات، علم و ہنر کا سرور میری متاعِ حیات، ایک دلِ ناصبور

فلسفہ نے یہ سنا تو اقبال سے پوچھا کہ ذرا یہ تو بتائیے کہ اس آشفتہ سامانی اور چاک گریبانی کی منطقی توجیہ کیا ہے؟ اقبال نے ہنس کر کہا کہ

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

جائیے جائیے طبعیات کی جھاڑیوں نے اس کا دامن الجھایا اور کہا کہ ذرا ٹھہریئے کہ آپ کو آغازِ حیات کا راز بتاؤں۔ اقبال نے سنا اور قلندرانہ استغنا کی شان سے جواب دیا کہ

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

فلکیات نے کہا کہ میری رصد گاہوں سے فضائے آسمانی کی محیر العقول پہنائیاں اور ان میں تیرنے والے تحیر انگیز کروں کا تماشا نظر آئیگا۔ اُس مردِ دانا نے سنا اور ایک خندۂ زیر لبی سے جواب دیا کہ اب یہ لا انتہا وسعتیں میرے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام اس زمین و آسماں کو لامکاں سمجھا تھا میں

اقبال کے سامنے جب مقصودِ حیات اس طرح واضح ہو گیا تو اس نے اپنے لئے مستقبل کا راستہ متعین کر لیا۔ اس کے سامنے عشق کے اس زندگی بخش پیغام کو تمام دنیا کے انسانوں میں عام کرنا تھا۔ یاد رکھئے۔ جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا عشق سے اقبال کی مراد وہ نظامِ ربوبیت تھا جو وحی کی بنیادوں پر استوار ہوتا تھا اور جس کا مقصود نوعِ انسانی کی فطری صلاحیتوں کا کامل نشوونما تھا یہ نظام تمام انسانیت کیلئے تھا لیکن اس کی ابتدا کسی ایسے خطۂ زمین اور ایسے گروہ سے کی جا سکتی تھی جو اس پیغام کی عملی تشکیل کے لئے اولیں خمیر بن سکے۔ اس نے جب اپنی قوم پر نگاہ ڈالی تو اسے یکسر راکھ کا ڈھیر پایا۔ بایں ہمہ اُسے اس راکھ کے ڈھیر کے نیچے کچھ سلگتی ہوئی چنگاریاں بھی دکھائی دیں۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی آتش نوائی سے اس راکھ کے ڈھیر کو شعلۂ جوالہ بنا کر اس سے نورِ انسانی کے لئے زندگی کی حرارت کا کام لیگا چنانچہ اس نے یورپ ہی سے اپنے رفقاء کو اپنے اس پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ عبدالقادر مرحوم کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:-

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق سنگِ امروز کو آئینہ فردا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

بلکہ اس سے بھی زیادہ واضح اور متعین انداز سے کہ

گئے وہ ایام اب زمانہ نہیں ہے صحرا و دیوں کا جہاں میں مانندِ شمع سوزاں، میانِ محفل گداز ہو جا
وجودِ افراد کا مجازی ہے ہستیِ قوم ہے حقیقی فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہِ حجاز ہو جا

ان آرزوؤں اور دعاؤں۔ ان ولولوں اور تمناؤں کو دل میں لیکر اقبال ہندوستان واپس آیا۔ گیا تو ایک مجموعۂ اضداد تھا۔ واپس آیا تو ہمہ تن یک رنگ و یک آہنگ۔ گیا تو دل میں شکوک و شبہات کی ہزاروں پھانسیں لئے ہوئے۔ آیا تو اسے سکون و طمانیت کی جنت بنائے ہوئے۔ گیا تھا فلسفی بننے کے لئے۔ آیا نوعِ انسانی کیلئے پیامبر بن کر۔ گیا تھا سازِ عقل لیکر، آیا سوزِ عشق خرید کر اور اس متاعِ سوز و ساز اور سرمایۂ تپش و گداز کو لیکر آیا۔ اس برف آلود سرزمینِ مغرب سے جہاں عشق و ایمان کی رہی سہی چنگاریاں بھی بجھ جایا کرتی ہیں۔ گیا تھا تو وہ انداز تھا اور واپس آیا تو اس شان سے کہ کیف و مستی کی فضاؤں میں جھوم رہا ہے اور وجد و رقص کے عالم میں گنگنا رہا ہے کہ

کافر ہندی ہوں میں، دیکھ میرا ذوق و شوق دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود

شوق میری لے میں ہے، شوق میری نے میں ہے نغمہ اللہ ہو، میرے رگ و پے میں ہے

لیکن عشق و جنوں کی ان وادیوں میں پہنچکر اقبال نے عقل کو تیاگ نہیں دیا۔ اس لئے کہ عقل و خرد کو تیاگ دینا، قرآن کا پیغام نہیں رہبانیت کا مسلک ہے۔ قرآن کی رو سے عقل اور وحی کا تعلق ایسا ہی ہے جیسے انسان کی آنکھ اور روشنی کا تعلق ہے جو اپنی آنکھ سے کام نہیں لیتا اس کیلئے روشنی کا عدم و وجود برابر ہے اور آنکھ بغیر روشنی کے بیکار ہے۔ لہٰذا قرآن کا پیغام عقل کو وحی کے تابع رکھنا اور ان دونوں کے امتزاج سے ایک نئی دنیا کی تعمیر کرنا ہے۔ چنانچہ عقل و عشق، خرد و جنوں، ذکر و فکر، خبر و نظر، علم و حضور کے اس حسین امتزاج کا نام تھا اقبال جس نے کہا کہ

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

اور مشرق و مغرب دونوں کو یہ پیغام دیا کہ

غربیاں را زیرکی ساز حیات شرقیاں را عشق راز کائنات

زیرکی از عشق گردد حق شناس کار عشق از زیرکی محکم اساس

عشق چو با زیرکی ہمبر شود نقشبند عالم دیگر شود

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ عشق را با زیرکی آمیز دہ

مغرب نے تنہا عقل کی ابلہ فریبیوں سے ساری دنیا کو قمار خانہ بنا رکھا تھا۔ مشرق میں ملا اور صوفی کی کم نگہی نے اسلام جیسے انقلاب در آغوش نظامِ حیات کو بے نتیجہ رسوم کا مجموعہ اور محکومی و ناامیدی کا مسلک گوسفندی کا نقیب قرار دے رکھا تھا۔ اقبال کے پیشِ نظر مغرب اور مشرق کے ان دونوں تصوراتِ زندگی کے خلاف جنگ کرنا تھا۔ چونکہ فطرت نے اقبال سے یہ بہت بڑا کام لینا تھا اس لئے اسے اس مقصدِ عظیم کے لئے خاص طور پر تیار کیا گیا۔ فرشتوں کے نام خدا کے پیغام میں ہے کہ

تہذیبِ نوی کارگہ فتنہ گری ہے آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

اور انہی آدابِ جنوں کا اثر تھا کہ اس نے تہذیبِ حاضر کے اس نگاہ فریب طلسم کو توڑ کر رکھ دیا

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختی خارا

لیکن تہذیبِ نو کے اس سیلاب سے کہیں زیادہ ہلاکت انگیز خود اپنے ہاں کے مکتب و خانقاہیت کی تعلیم تھی جس کے خلاف اقبال کو مسلسل جہاد کرنا تھا۔ اس کے لئے اس نے متلاشیانِ حقیقت کو پکار کر کہا کہ

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

وہ ان سے بار بار کہتا کہ

رہ و رسمِ حرم نامحرمانہ کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے میرا پیراہنِ چاک نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ

اس نے دیکھا کہ مدعیانِ علمِ شریعت انسانی زندگی کے ابتدائی مسائل تک سے ناواقف ہیں اس لئے ان کے لئے قطعاً ناممکن ہے کہ وہ مقامِ کبریا کو پہچان سکیں۔ اس نے ملا سے برملا کہا کہ

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال تری اذان میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

جب اربابِ شریعت و طریقت کی سطح بیں نگاہیں اُس کے حقیقت رس پیغام پر تنقید کرتیں تو وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا اور بے نیازانہ کہہ دیتا کہ یہ بچارے معذور ہیں اس لئے معاف کر دینے کے قابل۔ یہ نہیں جانتے کہ میں کیا کہتا ہوں اور کس مقام سے کہتا ہوں۔

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

لیکن جاننے والی نگاہیں جانتی تھیں کہ یہ دانندۂ اسرارِ حقیقت کیا کہتا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے اور اعتراف کرتے کہ

رازِ حرم سے شاید اقبال باخبر ہے ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ

وہ جانتا تھا کہ ہماری مروجہ شریعت اور طریقت دونوں کے مستعار تصورات اسلام کے عجمی ایڈیشن ہیں جن پر صرف ڈسٹ کور (DUST COVER) قرآن کا ہے۔ اسے خوب معلوم تھی کہ یہ عجمی نظریاتِ زندگی فکرِ اسلامی کے شجرِ طیب پر اکاس بیل کی طرح مسلط ہیں۔ جب تک اس اکاس بیل کو الگ نہیں کیا جائے گا شجرِ ملت کبھی شگفتہ و شاداب نہیں ہو سکے گا۔ اسلئے وہ پوچھنے والوں سے کہتا کہ

کئے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

ظاہر ہے کہ ایسے انقلاب آفریں پیغام کی ہر طرف سے مخالفت ہونی تھی۔ لیکن اس نے اس مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی آتش نوائی کو مسلسل جاری رکھا اور اس طرح رفتہ رفتہ فضائے ملت اس کی آہِ نیم شبی اور نالۂ سحری سے اثر پذیر ہوتی چلی گئی۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر اس نے کہا تھا کہ

میری نوا سے ہوئے زندہ عارفِ عامی دیا ہے میں نے انھیں ذوقِ آتش آشامی

لیکن اس کے باوجود اس کی قوم جس خوابِ گراں میں سو رہی تھی اسے اس سے جگانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ ہزار برس سے گاڑی زندگی کی

صراطِ مستقیم چھوڑ کر دوسری پٹڑی پر چلی جا رہی تھی۔ اسے اُس مقام سے واپس لا کر پھر سے صحیح لائن پر ڈالنا، آفتابِ مغرب کی طنابیں کھینچ کر اسے سوئے مشرق لانا تھا۔ اسے خدا سے شکایت ہی یہ تھی۔

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا — رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو — لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر یہ ہے میرے نفس کی کہ خزاں میں — مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے — جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

واضح رہے کہ اقبال کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ نہیں تھا کہ انگریزوں کی بجائے حکومت ہمارے اپنے ہاتھ میں آجائے۔ بلکہ یہ کہ اس خطۂ زمین کے مسلمان، انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی بجائے، ضابطۂ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اسی مقصد کے لئے اس نے ملت اسلامیہ کو پاکستان کا تصور دیا تھا۔ لیکن قوم نے اُس وقت اس تصور کو ایک شاعر کا افسانوی تخیل سمجھ کر اس پر غور و فکر کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک طرف اپنی قوم کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف مخالف قوتیں برق رفتاری کے ساتھ چاروں طرف سے ہجوم کر کے امنڈے چلی آ رہی تھیں۔ حالات ایسے نامساعد تھے لیکن بایں ہمہ، وہ اس سیلاب بلا انگیز میں روشنی کے مینار کی طرح کھڑا تھا کہ زمانہ کی تلاطم انگیز موجیں آئیں اور اپنا سر پھوڑ کر واپس چلی جائیں۔ یہی تھے وہ حالات جن کے متعلق اس نے کہا تھا کہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے — وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

ان ناموافق حالات میں ہمراہانِ سُست عناصر اسے مایوسیوں کے چھلاوے سے ڈراتے اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے کہ

ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے — سینۂ سوزاں ترا فریاد سے معمور ہے
قصۂ گل ہم نوایانِ چمن سنتے نہیں — اہلِ محفل تیرا پیغامِ کہن سنتے نہیں
زندہ پھر وہ محفلِ دیرینہ ہو سکتی نہیں — شمع سے روشن شبِ دوشینہ ہو سکتی نہیں

تو اس کا چہرہ تمتما اٹھتا۔ پیشانی جوشِ حمیت سے شفق آلود ہو جاتی۔ وہ امیدوں کی ایک دنیا اپنے جلو میں لے اٹھتا اور جزم و یقین کی پوری قوتوں سے کہتا کہ

ہم نشیں! مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں — اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں
نبضِ موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے — اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے
حق نے عالم اس صداقت کیلئے پیدا کیا — اور مجھے اس کی حفاظت کیلئے پیدا کیا
میری ہستی، پیرہن عریانیٔ عالم کی ہے — میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے — ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
ہاں یہ سچ ہے، چشمِ بر عہد کہن رہتا ہوں میں — اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اُس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

وہ جانتا تھا کہ نا امیدیوں کے چھلاوے سے ڈرانے والے وہی ہیں کہ مدت ہائے دراز سے تقلید اور بے عملی کے حیات سوز اثرات ان کی ہڈیوں کے گودے تک میں سرایت کر چکے ہیں اور وہ اپنی زندگی میں خفیف سی تبدیلی کے تصور تک سے گھبرا اٹھتے ہیں۔ وہ اِن پیرانِ کہن سے کوئی توقع نہیں رکھتا تھا، اس لئے وہ اپنے پیغام کا حقیقی مخاطب ان نوجوانوں کو سمجھتا تھا جن کے قلب و نگاہ کی تبدیلی، قوموں کی تقدیریں بدل دیا کرتی ہے۔ انہی کو وہ اپنی متاعِ سوز و گداز کا وارث سمجھتا اور انہی کے لئے راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں مانگا کرتا تھا کہ

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا وہی جامِ گردش میں لا ساقیا
خرد کو غلامی سے آزاد کر جوانوں کو پیروں کا استاد کر
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے دلِ مرتضیٰؓ، سوزِ صدیقؓ دے
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے مرا عشق میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری، آرزوئیں مری امیدیں مری جستجو میں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

ملت کے مستقبل کا یہی غم پنہاں تھا جس نے اقبال پر راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ علی بخش[1] کا بیان ہے کہ جن دنوں آپ کی طبیعت زیادہ خراب تھی، ایک رات، پچھلے پہر، میں نے سنا کہ پلنگ سے سسکیوں کی آواز آ رہی ہے۔ چپکے سے قریب گیا تو دیکھا کہ آپ تکیہ پر کہنیاں ٹیکے دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں۔ رو رہے اور گنگنا رہے ہیں کہ

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا تھم اے رہرو! کہ پھر شاید کوئی مشکل مقام آیا

[اس غزل کے دو شعر اور بھی سنئے۔ فرماتے ہیں:

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغِ بے نیام آیا

[1] اقبال کا فدائی جو دنیا میں عام طور پر اقبال کے ملازم کی حیثیت سے متعارف ہے لیکن جو درحقیقت اقبال کا عاشق تھا اور اس عشق کو آجتک زندہ رکھے ہوئے ہے۔

چل اے میری غریبی کا تماشا دیکھنے والے ۔۔۔ وہ محفل اٹھ گئی جس دم کہ مجھ تک دورِ جام آیا]

علی الصباح حسب معمول حکیم صاحب آئے۔ دیکھا تو رنگ معمول سے زیادہ زرد ہے اور چہرہ پہلے سے زیادہ افسردہ۔ آنکھیں سوج رہی ہیں اور کمزوری بڑھ گئی ہے۔ کیفیتِ مزاج کا پوچھا تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور بمشکل اتنا کہہ سکے کہ

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات ۔۔۔ کہنہ ہے بزمِ کائنات تازہ ہیں میرے واردات

حکیم صاحب نے ہلکے سے تبسم سے کہا کہ آپ تو دنیا بھر کے مسائل کا حل دوسروں کو بتاتے رہتے ہیں۔ اپنی مشکل کا حل کیوں نہیں تلاش کر پاتے! انھوں نے بھی اسی انداز کے تبسم زیرلبی سے فرمایا کہ کیا کہوں!

مقامِ ہوش سے آساں گزر گیا اقبال ۔۔۔ مقامِ شوق میں کھویا گیا یہ دیوانہ

حکیم صاحب نے پوچھا کہ بالآخر وہ کونسی بات ہے جس کا غم آپ کو اس طرح نڈھال کئے جارہا ہے۔ کہا کہ حکیم صاحب! آپ دیکھتے نہیں کہ

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق ۔۔۔ خلوتیانِ میکدہ، کم طلب و تہی کدو

میں کہ میری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ ۔۔۔ میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

حکیم صاحب نے کہا کہ آپ کا مرض زیادہ تشویش انگیز ہوتا جارہا ہے۔ آپ کو کچھ دنوں کے لئے ان تفکرات کو چھوڑنا ہوگا۔ انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب! میں جانتا ہوں کہ

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے

لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ

اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

اتنے میں ڈاک آگئی۔ دیکھا تو اس میں ایک خط ایک ایسے فلسفہ زدہ نوجوان کا تھا جس کے والد سے آپ کے دیرینہ مراسم تھے۔ اُس نے جیسا کہ فلسفہ کے ابتدائی مراحل میں اکثر ہوتا ہے جبکہ طالب علم کے افکار میں ہنوز پختگی نہیں آتی، نفسِ انسانی، وحی، حیات بعد الممات، مستقل اقدار، وغیرہ تصورات پر نہایت طنز آمیز اعتراضات کئے تھے۔ آپ نے خط پڑھ کر پنسل اٹھائی اور اسی کی پشت پر لکھ دیا کہ

میں اصل کا خاص سومناتی ۔۔۔ آبا میرے لاتی و مناتی

تو سید ہاشمی کی اولاد ۔۔۔ میری کفِ خاک برہمن زاد

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں ۔۔۔ پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

اقبال اگرچہ بے ہنر ہے ۔۔۔ اس کی رگ رگ سے باخبر ہے

شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز ۔۔۔ سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز

انکار کے نغمہ ہائے بے صوت ۔۔۔ ہیں ذوقِ طلب کے واسطے موت

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم ۔۔۔ دیں سرِ محمدؐ و براہیمؑ ۔

دل در سخنِ محمدی بند   اے پُورِ علیؓ ز بوعلی چند

ابھی اس خط کا جواب ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ لاہور کے ایک مشہور روزنامہ کے مدیر جن کا شمار آپ کے حلقۂ ارادتمنداں میں ہوتا تھا، اندر آ گئے۔ خیریتِ مزاج کے بعد کہا کہ آپ نے دیکھا ہے کہ آپ کے حالیہ بیان پر فلاں اخبار کے ایڈیٹر نے کیسے رکیک حملے کئے ہیں۔ آپ مسکرائے اور کہا کہ میں نے دیکھا تو نہیں۔ کل شام فلاں صاحب سے سنا ضرور تھا۔ انھوں نے جھجکتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ کوئی جواب لکھیں گے آپ نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا، کہ بھائی! میں ان جھمیلوں میں کبھی نہیں الجھتا؟ آپ مجھے جانتے ہیں کہ

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی   گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق   نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش   میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش   میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پر سوز و نظر باز و نکوبین و کم آزار   آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم   کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

حتیٰ کہ میرا تو یہ عالم ہے کہ

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبالؔ   کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

مدیر صاحب نے کہا کہ درحقیقت یہ ایک سازش ہے دو قوموں کے اس نظریہ کے خلاف جس کا تصور آپ نے پیش کیا ہے اور جس کی رو سے مسلمانانِ ہند کو اپنے مستقبل کے لئے ایک واضح اور درخشندہ نصب العین مل گیا ہے۔ آپ نے پھر مسکرا کر فرمایا کہ سازش ہے تو ہوا کرے مجھے اس کی کیا پرواہ ہے۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک   مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

بعد سہ پہر، حسب معمول پھر ملنے والوں کا اجتماع ہوا۔ دنیا بھر کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک صاحب نے کہا کہ (مولانا) حسین احمد مدنی نے آپ کے اشعار کے جواب میں جو بیان دیا ہے وہ آپ کی نظروں سے گذرا! فرمایا کہ ہاں میں نے دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ مولوی صاحب نے قوم اور ملت کے متعلق جو لفظی بحث چھیڑی ہے آپ اس کا کچھ جواب دیں گے؟ فرمایا کہ

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا   فقیہہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا
حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو   نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

پھر حقہ کا کش لگایا اور مسکراتے ہوئے فرمایا کہ

کہاں سے تو نے اے اقبالؔ سیکھی ہے یہ درویشی   کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

آپ کے حلقہ احباب میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جنھیں ہمیشہ اس بات کا قلق رہتا کہ نالائق اور جاہل لوگ بڑے بڑے مناصب و مدارج حاصل

کئے جاتے ہیں اور آپ ہیں کہ جن کی قابلیت کا سکہ ساری دنیا مان رہی ہے لیکن اس طرح ایک گوشے میں پڑے ہیں۔ وہ آتے اور آپ سے کہتے کہ فلاں اسامی خالی ہو رہی ہے۔ آپ اپنی آمادگی ظاہر کر دیجئے، فوراً کامیابی ہو جائے گی۔ آپ ان مخلص بہی خواہوں کی سادگی پر مسکراتے اور جی ہی جی میں کہتے کہ میں انہیں کس طرح بتاؤں کہ مبدأ فیض کی عنایاتِ خسروانہ نے مجھے کیا عطا کیا ہے اور یہ مجھے کس طرف بلا رہے ہیں۔ وہ زیادہ اصرار کرتے تو آپ ان سے کہتے کہ

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک — رکھتی ہے مگر طاقتِ پرواز مری خاک
وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقلِ ادراک — وہ خاک کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک
وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی — چُنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک
اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو — کرتی ہے چمک جس کی ستاروں کو عرقناک

جاوید سے آپ کو بہت محبت تھی۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا لیکن اس سے آپ بڑے کام کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک دن اس نے پوچھا کہ ابا جان آپ کے پاس نہ اچھے اچھے کپڑے ہیں، نہ قیمتی صوفے اور قالین ہیں۔ نہ بہت سے نوکر چاکر ہیں، نہ موٹر ہی ہے۔ لیکن آپ کے پاس بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ یہ آپ کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ بیٹا!

ہے میری بساط کیا جہاں میں — بس ایک فغانِ زیر بامی
اک صدقِ مقال ہے کہ جس سے — ہیں چشمِ جہاں میں ہوں گرامی

جب آپ لندن گئے ہیں تو جاوید نے پہلا خط اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا۔ اس کے جواب میں آپ نے اسے لکھا کہ

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر — نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو — سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں، میری غزل ہے میرا ثمر — مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے — خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

زمانہ آگے بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اقبال کے پیغام کی تندی اور تیزی بھی شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ اس کی نگہ بصیرت دیکھ رہی تھی کہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے اور اس کی بساطِ سیاست پر مسلمان کس طرح پٹ رہا ہے۔ اس آنے والے انقلاب کے تصور سے جوں جوں اس کا احساس شدید ہوتا جاتا اس کی نوا کی تلخی بھی تیز ہوتی جاتی۔ اقبال کے پیش نظر پوری انسانیت کے اندر ایک ایسا انقلاب برپا کرنا تھا جس سے یہ زمین بدل جائے، یہ آسمان بدل جائے اور خاکِ آدم کو وہ نمود حاصل ہو جس کے لئے اسے اس طرح سنوارا گیا تھا۔ انقلاب آفرینی کا یہی وہ جذبہ تھا جس کے متعلق اقبال نے کہا ہے کہ

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی — یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے پیدا

ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے ۔۔۔ گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

دوسرے مقام پر کہتے ہیں کہ

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی ۔۔۔ گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی

خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی ۔۔۔ رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے ۔۔۔ آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

اُدھر آسمان پر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں لیکن ادھر زمین والے ابھی یہی طے نہیں کر پائے تھے کہ اقبال جو کچھ کہتا ہے اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ کوئی کہتا کہ اس کے کلام میں سوز و گداز اور کیف و مستی کے تذکرے ان نقوش کے اثرات کا نتیجہ ہیں جو بچپن کی مشرقی تعلیم اور تصوف آمیز ماحول نے اس کے تحت الشعور میں مرتسم کر رکھے ہیں۔ کوئی کہتا کہ اس کی فکر نیٹشے، برگسان، الیگزینڈر، وارڈ، جیمز جیسے مغربی مفکرین کے فلسفہ کی رہینِ منت ہے۔ اقبال یہ سب کچھ سنتا اور ان سادہ لوح معترضین سے کہتا کہ جب تم اس منبع علم و یقین سے آشنا نہیں ہو جو میری فکر کا سرچشمہ ہے تو اس باب میں قیاس آرائیاں کیوں کرتے ہو؟ میری فکر نہ مشرقی مکتب و خانقاہ سے متاثر ہے نہ مغربی حکمت و فلسفہ کی منت پذیر۔

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض میری ۔۔۔ یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

میں نے مشرق و مغرب دونوں کے علوم و فنون کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان میں مجھے حقیقت کا کہیں سراغ نہیں ملا

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے ۔۔۔ یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

میری فکر کسی سے بھی متاثر نہیں۔ میں نے کسی چیز کو تقلیداً دیکھا ہی نہیں بلکہ ہر شے کو از خود پرکھا ہے اور اپنے نتائج آپ مستنبط کئے ہیں۔

میانِ آب و گل خلوت گزیدم ۔۔۔ ز افلاطون و فارابی بریدم

نکردم از کسے دریوزۂ چشم ۔۔۔ جہاں را جز بچشمِ خود نہ دیدم

یہی میرا مسلک ہے جس سے اب کیفیت یہ پیدا ہو چکی ہے کہ لاکھ پردوں میں چھپی ہوئی حقیقت، میری نگہ تجسس کے سامنے از خود بے نقاب ہو جاتی ہے۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ

اقبال نے کل اہلِ خیاباں کو سنایا ۔۔۔ یہ شعرِ نشاط آور و پرسوز و طربناک

میں صورتِ گل دستِ صبا کا نہیں محتاج ۔۔۔ کرتا ہے میرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

یہی وہ حقیقت کشائی ہے جس سے میری دیدہ وری کا یہ عالم ہے کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے ۔۔۔ عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

چنانچہ وہ جہانِ فردا جس کے انتظار میں آسمان کے تاروں کی آنکھیں ایک مدت سے محرومِ خواب ہیں میرا پیام اس کیلئے طائرِ پیش رس ہے

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں ۔۔۔ میری نواؤں میں ہے اسکی سحر بے حجاب

لہٰذا اس عالمِ ہست و بود کی حقیقت صرف اس پر کھل سکتی ہے جس کی سمجھ میں میرا پیغام آجائے۔

نظر آئیگا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا جسے آگئی میسر مری شوخیٔ نظارا

لوگ سمجھتے ہیں کہ اقبال، جاوید منزل میں پلنگ پر لیٹے لیٹے حقہ پیتا رہتا ہے اور شاعری کرتا رہتا۔ انھیں کیا معلوم کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے انھیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

یہ شاعری نہیں ہے۔ نہ ہی شاعری کسی پیغام بر کے شایانِ شان ہوتی ہے جس کے سامنے زندگی کا نصب العین متعین ہو، اس کا ہر قدم اُسی نصب العین کی طرف اٹھ رہا ہو، اور اسلئے وہ ہر مخاطب کو اسی منزل کی طرف دعوت دے رہا ہو، اسے شاعری سے کیا واسطہ!

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

یہ وہی "رازِ درونِ میخانہ" تھے جن کے متعلق میں نے زبورِ عجم میں کہا ہے کہ

زبردنِ درگذشتم، ز درونِ خانہ گویم سخنے نگفتۂ را چہ قلندرانہ گویم

تم اِسے شاعری سمجھتے ہو اور میں شاعری کو اپنے خلاف تہمت خیال کرتا ہوں۔

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیرازاں مردِ فرو دست کہ بر ما تہمتِ شعر و سخن بست

تم اِسے حُسن و شباب کے رنگین افسانے سمجھتے ہو؟ تم اِسے عہدِ کہن کی خواب آور داستانیں تصور کرتے ہو؟ تم یہی سمجھے بیٹھے ہو کہ یہ گُل و مُل کی فرضی کہانیاں ہیں؟ تمہارا اندازہ یہی ہے کہ یہ ایک شاعر کی دنیائے تصورات کی پریشاں خیالیاں ہیں؟ اگر تمہارا یہی اندازہ ہے تو کسقدر غلط ہے، تمہارا یہ اندازہ؟ اگر تمہارا یہی خیال ہے تو کسقدر باطل ہے تمہارا یہ خیال!! اگر تم جاننا چاہتے ہو کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ درحقیقت ہے کیا، تو آؤ! میرے مئے سخن کے پیالے میں جھانک کر دیکھو اس میں کیا نظر آتا ہے؟

دو عالم را تواں دیدن بہ مینائے کہ من دارم کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم
اگر دیوانہ آید کہ در شہر افگند ہوسے دو صد ہنگامہ برخیزد ز سودائے کہ من دارم
مخور نادان غم از تاریکیٔ شبہا کہ می آید کہ چوں انجم درخشد داغِ سیمائے کہ من دارم
ندیم خویش می سازی مرا، لیکن ازاں ترسم نداری تابِ آں آشوب و غوغائے کہ من دارم

سننے والے یہ سب کچھ سنتے لیکن ان کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آتا تھا کہ اگر یہ خیالات نہ فکرِ مغرب سے مستعار لئے ہیں نہ تصوراتِ مشرق سے، نہ یہ مکتب کی زلہ چینی ہے نہ خانقاہ کی دریوزہ گری۔ نہ یہ شاعری ہے نہ افسانہ طرازی۔ تو پھر بالآخر ان تصوراتِ حیات کا سرچشمہ کیا ہے؟ وہ مردِ خود آگاہ و خدا مست یہ کچھ سنتا اور کہتا کہ آؤ تمہیں بتاؤں کہ میرے انقلاب بردوش پیغام کا سرچشمہ کیا ہے۔ اس کا سرچشمہ ہے

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

میں نے عمر بھر اسی شمع عالم تاب سے اکتسابِ ضیا کیا ہے۔ اسی یمِ ناپیدا کنار سے حکمت کے موتی نکالے ہیں۔

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام شرح رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

اس لئے

از تب و تابم نصیب خود بگیر بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

لیکن سننے والے کہتے کہ اس قرآن کو تو ہم ہر روز پڑھتے ہیں۔ اس کی تفسیریں بھی دیکھتے ہیں۔ ہمیں تو اس میں یہ کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ دانائے رازاں ساده لوحوں کی یہ باتیں سنتا اور کہتا کہ قرآن اپنے آپ کو اس طرح بے نقاب نہیں کیا کرتا۔ اس کے سمجھنے کے انداز کچھ اور ہی ہیں۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

اس لئے

چو مسلماناں اگر داری جگر در ضمیرِ خویش در قرآں نگر

برادران! یہ ہے وہ اقبال جس نے کہا تھا کہ

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست این مسافر چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

میں نے بھی اسی اقبال کی تلاش میں ساری عمر گذار دی۔ اسے مختلف وادیوں اور متنوع شاہراہوں میں ڈھونڈتا رہا۔ لیکن آخر الامر قرآن ہی سے اس کی راہ اور منزل کا سراغ پایا۔

اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں بڑی مدت کے بعد آخر یہ شاہیں زیرِ دام آیا

دیکھئے۔ اپنا خریداری نمبر تلاش کیجئے

اپریل ۱۹۵۳ء کی اس اشاعت کے ساتھ آپ حضرات کا چندہ (جن کے نمبر خریداری درج ذیل ہیں) ختم ہو گیا ہے لہذا آئندہ ماہ مئی ۱۹۵۳ء کا پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی بھیجا جائے گا۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ۲۰ اپریل ۱۹۵۳ء سے پہلے پہلے آپ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں کہ اس میں ادارہ کو سہولت اور آپ کو کفایت ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے خدانخواستہ آپ رسالہ کی خریداری آئندہ جاری رکھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو ۲۰ اپریل سے پہلے پہلے ادارہ کو اپنے اس فیصلہ سے مطلع فرما دیں ورنہ ادارہ کی طرف سے مرسلہ وی پی کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہوگا۔ فہرست خریداران جن کا چندہ ختم ہو گیا ہے۔

۳۱۶ — ۳۱۸ — ۴۸۰ — ۵۰۱ — ۵۰۳ — ۵۰۹ — ۸۴۵ — ۸۶۴ — ۸۶۵ — ۸۶۷ — ۸۶۸ — ۸۶۹ — ۸۷۰ — ۸۷۱ — ۸۷۲
۸۷۳ — ۸۷۴ — ۸۷۶ — ۸۷۷ — ۸۷۸ — ۸۸۰ — ۸۸۱ — ۸۸۳ — ۸۸۶ — ۸۸۷ — ۸۸۹ — ۸۹۰ — ۸۹۱ — ۸۹۳
۸۹۴ — ۸۹۵ — ۸۹۶ — ۸۹۷ — ۸۹۸ — ۹۰۸ — ۸۴۴ — ۹۶۴ — ۹۸۱ — ۱۱۷۳ — ۹۴۶ —

بہ نستعین

قبرِ اقبال کے پاس

(محترم عرشی صاحب)

میرے سامنے بہت سی رنگارنگ کی عینکیں پڑی تھیں اور بہت سے لوگ بیٹھے تھے جو اپنی اپنی پسند کی عینک لگاتے اور مصروفِ مطالعہ ہو جاتے، ہر عینک کے خانے پر ایک ایک لفظ لکھا تھا، کسی پر شیعیت، کسی پر حنفیت، کسی پر تصوف اور کسی پر روایت وغیرہ ذالک۔ میں نے بعض عینکوں کا امتحان کیا، مثلاً شیعیت کی عینک لگائی تو مجھے قرآن مجید کے ہر ہر صفحے پر امیر المومنین علیؓ اور ان کی اولاد (رضی اللہ عنہم) کی مقدس تصویریں نظر آئیں۔ اس کے بعد میں نے تصوف کی عینک ناک پر رکھی تو فوراً سین بدل گیا اور بہت سے بزرگ مراقبہ و مشاہدہ، فنا فی الشیخ، فنا فی الرسول، فنا فی اللہ اور وحدتِ وجود و شہود کے شغل میں معتکف نظر آئے۔ میں نے یہ دلچسپ عینک اتار کر روایت کی عینک سے نظارہ کیا تو عجیب لطف آیا، ہر ہر آیت ایک مقفل قلعہ بن گئی اور اس کے دروازے پر جامعین حدیث اور شارحین صحاح وغیرہ کے غول کے غول آپس میں دست و گریباں دکھائی دیئے۔ علی ہذالقیاس بہت سی عینکیں بدلیں اور بے شمار مناظر دیکھے، آخر میں ایک عینک جس پر احمدیت لکھا تھا، لگائی تو پورے قرآن پر مرزا غلام احمد صاحب قادیانی چھائے ہوئے نظر آئے، ہر ہر آیت انہی کی دہائی دے رہی تھی، اور انہی کی تشریف آوری کی بشارت کا نغمہ سنا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ مختلف عینکوں والے لوگ اپنی عینک کے سوا دوسروں کی عینک سے نفرت کرتے تھے۔ اور اپنی عینک سے جو کچھ نظر آتا تھا اسی کی صحت پر اصرار کرتے اور دوسروں کو بھی وہی کچھ منوانے کے لئے بیتاب نظر آتے تھے، اس سلسلہ میں بہت کچھ کشت و خون اور حرب و ضرب کی ہولی بھی کھیلی گئی۔ ان مختلف اللون عینکوں کی برکت سے نسلِ آدمؑ اور امتِ محمدیہ کا بہت سا حصہ ضیاع و ہلاکت کی نذر ہوا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ عینکیں جو خود لگائی تھیں کچھ اس طرح آنکھوں کے ساتھ چپک گئیں کہ بڑے بڑے اذیت ناک آپریشنوں کی مدد سے بھی اتاری نہ جا سکیں۔ آخر ایک شخص جس کا لباس مغربی اور زبان مشرقی تھی نمودار ہوا، اس نے ایک ایک کر کے ان عینکوں کو آزمایا اور اپنی غیر معمولی قوت سے اتار پھینکا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر تنہا قرآن کی عینک آنکھوں پر رکھ کر وسیع کائنات عالم کا مطالعہ کیا۔ اب اس کو وہ کچھ نظر آیا جو کسی نے نہ دیکھا تھا۔ اس نے قرآن کو دیکھا اور قرآن کے آئینے میں وہ سب کچھ دیکھا جو قرآن دکھانا چاہتا ہے۔ اب اس نے عزم کیا کہ دوسرے لوگوں کی عینکوں کو چکنا چور کر دے اور جو اسے نظر آ رہا ہے ان کو بھی دکھا دے، اس نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اسی کام کے لئے وقف کر دیا۔

او بہر جمعیتے نالاں شدے   جفت خوش حالاں و بدحالاں شدے

لیکن افسوس، ہزار افسوس کہ

ہر کسے از ظن خود شد یار او وز درون او نجست اسرار او

یہ تھا اقبال جو اردو میں، فارسی میں، انگریزی میں اور نظم و نثر میں، خلوت و جلوت میں عمر بھر چلاتا رہا، چیختا رہا بلکہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دہاڑیں مار مار کر روتا رہا کہ میں شاعر نہیں ہوں، غزل سرا نہیں ہوں، میرے پاس تمہارے لئے کوئی سامان تفریح نہیں ہے میں ایک ٹھوس پیغام کا حامل ہوں وہ پیغام جو قوموں کی حیات و ممات کے متعلق حتمی اور فیصلہ کن انداز رکھتا ہے۔

وہ نہ صرف مسلمان کی بلکہ تمام کائنات انسانیت کی فلاح قرآن میں دیکھتا تھا، اس قرآن میں جو اس کے اول مخاطبین (رضی اللہ عنہم) نے بغیر کسی عینک کے دیکھا تھا، ان کے پاس شیعی سنی وغیرہ کی کوئی رنگ دار عینک تھی ہی نہیں۔ وہ اس میں یقین رکھتا تھا کہ آج بھی بھٹکی ہوئی اور باہمی کشمکش کے دوزخ میں مبتلا انسانیت کی نجات اسی قرآن میں مرکوز ہے جس کی وحدت وحدتِ خداوندی کی طرح شرک کو قطعاً گوارا نہیں کر سکتی۔ جس طرح پہلی قوموں نے خدا کے ساتھ دیوتاؤں کو شریک کر کے سب سے بڑے اور ناقابل مغفرت گناہ کا ارتکاب کیا، اسی طرح مسلمانوں نے اس کے کلام کے ساتھ دوسرے کلاموں کو "مثلہ معہ" قرار دے کر ویسے ہی ہولناک شرک کو اپنا لیا۔ اس کے نتیجے میں صدیوں سے در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ان ٹھوکروں کا باعث کیا ہے۔ اقبال نے کھلے لفظوں میں اعلان کیا کہ

یہ امت روایات میں کھو گئی حقیقت خرافات میں کھو گئی

قوم نے اس امر واقعہ اور حقیقت ثابتہ کو بھی ایک شعر سمجھا اور "واہ وا" کہدیا، جیسے عموماً غزل و مثنوی کے اشعار پر کہہ ہی دیا جاتا ہے یہ شعر اور اقبال کے اس قسم کے بہت سے شعر اتنے صاف اور واضح ہیں کہ ان کی شرح کے لئے کسی رازی و غزالی کی ضرورت نہیں — روایتوں کے مدہوش، تصور کے مخمور، ہفتاد و دو ملت کے شیدائی سب ہی اقبال کے کلام کو پڑھتے ہیں اس کی شرح لکھتے ہیں، لیکن اس کے پیغام کی روح سے دامن بچاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

قرآن پاک نے بعض لوگوں کے متعلق فرمایا تھا کہ انھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے قریب قریب تمام مذاہب عالم ملوث ہیں۔ دسہرے کے دنوں میں راون، رام، لچھمن اور سیتا وغیرہ کے سوانگ، جس پر لاکھوں روپے اور بے اندازہ وقت صرف ہو جاتا ہے، کھیل تماشا نہیں تو کیا ہے اور ہنود اسے اپنے مذہبی تقدس کا مظاہرہ سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی ان کی طرح دوسرے مذاہب کی بھی بے شمار رسمیں ہیں۔ مسلمان جن کو یہ تنبیہ سمجھائی گئی تھی وہ سب سے آگے بڑھ گئے — اقبال نے اپنے کلام میں ان سب کے خلاف زوردار احتجاج کیا۔ اور دین کے ٹھوس حقائق کی طرف قوم کو متوجہ کرنے کے لئے اپنی تمام علمی و فلسفی کوششوں کو صرف کر دیا۔

لیکن قوم نے اقبال کے ساتھ کیا کیا؟ اس کا جواب نہایت تلخ لیکن بالکل صحیح یہ ہے کہ اقبال کو بھی ہماری طفلانہ طبیعتوں نے کھیل تماشا بنا دیا۔ بھانڈوں، قوالوں اور ریڈیو والوں نے اس سے تفریح عوام کا کام لیا۔ جو ذرا پڑھ لکھ گئے۔ انھوں نے اقبال پر لکھنے کو اپنی شہرت و معاش کا ذریعہ بنایا۔ عموماً اخلاق سے معرّا اور دین سے کورے لوگ ہر سال "اقبال اقبال" کر کے ایک گرمی ہنگامہ

پیدا کر دیتے ہیں پھر سال بھر سوئے رہتے ہیں۔

میں اس وقت لبریز جذبات دل کے ساتھ، قدیم تاریخی فضا میں، مسجد عالمگیرؒ کے کونے پر، قبر اقبال کے پائینتی بیٹھا ہوں۔ مجھے یہ مرتبہ حاصل نہیں ہے کہ زیر مزار خوابیدہ ہستی کی روح سے باتیں کر سکوں، لیکن حجرۂ مرقد کے اندر باہر جو آیات و اشعار مرقوم ہیں، وہ مجھے ایسے ہی محسوس ہو رہے ہیں جیسے علامہ مرحوم زندگی میں اپنی چارپائی پر بیٹھے مجھ سے ہم کلام ہو رہے ہیں اور میں چارپائی کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھا اس صحبت سے شرف اندوز ہو رہا ہوں۔ حجرے کا مسجد کی جانب جو رخ ہے اس پر یہ رباعی مندرج ہے۔

بیا تا کار ایں امت بسازیم　　قمار زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجد شہر　　کہ دل در سینۂ مُلّا گدازیم

انتخاب کرنے والوں نے کتنا اچھا انتخاب کیا ہے۔ گویا شاہی مسجد کی طرف منہ کر کے حضرت علامہ پکار رہے اور اس وقت تک پکارتے رہیں گے جب تک ملائے مسجد کے دل کو سنگ و آہن کے بنے ہوئے دل کو اپنی آہ و زاری سے موم کی طرح گداز نہ کر لیں۔ آہ ہمارا مُلّا۔ تیرہ صدیوں سے امت کی زبونی و بربادی کا تنہا ذمہ دار ملّا کب تک اپنی ہوا و ہوس کے غلافوں میں خدا کے نور کو چراغ زیر دامن بنائے رہیگا۔ مرحوم نے علمائے ربانی اور صلحائے امت کے فضائل کا فراخ دلانہ اعتراف کرتے ہوئے اپنے کلام میں عوام پر متصرف مُلّا کی مضرت رسانیوں سے قوم کو صاف طور پر آگاہ کر دیا ہے۔

جاوید نامہ کی افلاکی سیر میں جب علامہ فلک عطارد پر پہنچتے ہیں تو سید جمال الدین افغانی اور ترک سالار سعید حلیم پاشا کی روحوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس اثنا میں علامہ پاشائے موصوف سے سوال کرتے ہیں کہ

آپ نے اپنی تقریر میں کتاب اللہ کی محکمات کی وضاحت فرمائی ہے لیکن یہ جس عالم کی باتیں ہیں وہ ابھی پردۂ غیب سے باہر نہیں آیا اس کے چہرہ سے پردہ کیوں نہیں اٹھتا؟ ہمارا ضمیر اس عالم قرآنی کی تعمیر پر آمادہ کیوں نہیں ہوتا، ہمارے سامنے اس کے برعکس سراسر ایک عالم فرسودہ ہے جو ہر قسم کے ذلت و ادبار سے آلودہ ہے اور ملت اسلامیہ اس کی خاک میں بے حس و حرکت پڑی ہے۔ تاتار و کُرد کے سینے کا سوز ختم ہو چکا۔ کیا مسلمان مر گئے یا قرآن ہی فوت ہو گیا؟

کس قدر تڑپتے اور پگھلتے ہوئے دل سے یہ آواز اٹھ رہی ہے!

رفت سوز سینہ تاتار و کُرد　　یا مسلماں مرد یا قرآں بمرد!

اس سوال کا جواب سعید حلیم پاشا کی زبان سے سنئے

دیں حق از کافری رسواتر است　　زاں کہ ملا مومن کافر گر است

از شکر نی ہائے آں قرآں فروش　　دیدہ ام روح الامیں را در خروش
زانسوئے گردوں دلش بیگانۂ　　نزد او ام الکتاب افسانۂ
بے نصیب از حکمت دین نبیؐ　　آسمانش تیرہ از بے کوکبی

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد — ملت از قال و اقولش فرد فرد

ان اشعار کی تفصیلی شرح کی مجھ میں تاب نہیں۔ ملاّ کی پوری تاریخ، اس کی تاریخی ہولناکیاں، اس کا قطعی تاریک مستقبل ان اشعار میں لپیٹ دیا گیا، تمام دنیائے اسلام اگر اپنا احیاء و ابقاء چاہتی ہے تو اسے ملاّ کے بے پناہ حملوں اور درہم رنگ زمین دام سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا ورنہ ہمارا مستقبل ہمارے آپس کی خونریزیوں سے بھرے ہوئے ماضی سے مختلف نہیں ہو سکتا۔

بقول علامہ مُلاّ نے ہمیں وہ "دینِ حق" عطا فرمایا ہے جو کفر سے بھی زیادہ ذلیل ہے — ظاہر ہے کہ کفر کم از کم دنیوی نعمتوں سے تو بہرہ ور ہو رہا ہے۔

ملاّ نے کتاب پاک پر وہ مظالم ڈھائے ہیں کہ آسمان پر حضرت جبرئیل علیہ السلام فریاد کر رہے ہیں

ملاّ ہی وہ حضرت ہیں جنہوں نے کتاب حقائق کو قصہ کہانی بنا کر رکھ دیا۔ تاریک دماغ ملا دین پیغمبر کے انوار سے یکسر محروم رہ گیا۔

انجام سے بے پروا، بدذوق اور بیہودہ کوش مُلاّ نے ملتِ اسلامیہ کی ہیئت اجتماعیہ کو اپنی غیر متناہی خرافات سے پارہ پارہ کر دیا۔

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اتنا کچھ کہہ کر اقبال کی زبان خاموش ہو گئی ہوگی۔ اس نے اپنے دل کا بخار ملاّ کے خلاف نکال لیا؟ نہیں نہیں وہ ابھی کچھ اور کہنا چاہتا ہے؟

مکتب و ملا و اسرار کتاب — کور مادر زاد و نور آفتاب

یعنی مسلمان کو مُلاّ سے قطعی طور پر مایوس ہو جانا چاہیے اس فرقے سے کبھی، کسی خیر کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ مُلاّ کی تمام مکتبی تعلیم کتاب اللہ سے سراسر متضاد اور اس کے منافی ہے۔ اگر مادر زاد اندھا نور آفتاب سے بہرہ ور ہو سکتا تو ملاّ سے بھی کتاب فہمی کی کچھ امید ہو سکتی تھی۔ ایک آخری بات بھی سن لیجئے۔

دین کافر فکر و تدبیر جہاد — دین ملا فی سبیل اللہ فساد

ہماری ساری تاریخ مُلاّ کی فساد آرائیوں سے رنگین ہے۔ مُلاّ نے کبھی دنیا پرست ملوک کا آلہ کار بن کر اور کبھی الگ اپنی دکان تفرقہ سجا کر مسلمانوں کے خون سے اپنے چمن مراد کی آبیاری کی۔ مُلاّ نے ہمیشہ جلیل القدر ائمہ اسلام اور غمخوارانِ ملت، علماء ربانی کے خلاف محاذ قائم کئے رکھا۔

اب میں حجرہ مزار اقبال کی چھت کی طرف دیکھ رہا ہوں میرے سامنے یہ اشعار حیات و حرکت کی تابانیوں سے چمکتے ہوئے نظر آرہے ہیں

دمِ مرا صفتِ بادِ فرودیں کردند — گیاہ را ز سرشکم چو یاسمیں کردند

نمود لالہ صحرا نشیں ز خونابم — چناں کہ بادہ لعلے بساتگیں کردند

بلند بال چنانم کہ بر سپہر بریں — ہزار بار مرا نوریاں کمیں کردند

فروغ آدم خاکی ز تازہ کاری ہاست — مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند

چراغ خویش برافروختم کہ دست کلیم — دریں زمانہ نہاں زیر آستیں کردند

در آ بسجدہ و یاری ز خسرواں مطلب — کہ روز فقر نیاگان ما چنیں کردند

میرے خیال میں علامہؒ کی پوری تعلیم کی روح اس ایک غزل میں سما گئی ہے۔ بعض اشارات ملاحظہ فرمائیے:۔

ملت اسلامیہ ایک خزاں زدہ چمن ہے جس کے لئے حکیم امت کی کوشش بادِ بہاری کا حکم رکھتی ہے۔ ہم جو گھاس کے تنکے ہو کر رہ گئے ہیں۔ شاعر کے اشک سحر گاہی کی آبیاری سے پھر پھولوں کی بو باس حاصل کر سکتے ہیں۔

انسان کا مرتبہ بلند ملائک کے لئے قابل رشک ہے۔

تمام کائنات عالم میں انسان ہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ آگے سے آگے بڑھ رہا ہے اور اوپر سے اوپر اٹھ رہا ہے اس کے برعکس اگر وہ جمود کا شکار ہے تو اس کی انسانیت مشتبہ ہے۔

ملت بیضا کے حقائق اس زمانے میں رسم و اوہام اور روایات و حکایات کے نیچے چھپ گئے ہیں۔ ترجمان حقیقت ان کے چہرے سے ان غلیظ نقابوں کو نوچ رہے ہیں۔

مسلمان کی خودی کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے سامنے سرِ نیاز خم نہ کرے۔ ہمارے اسلاف نے سخت سے سخت حالات میں ایسا ہی نمونہ پیش کیا تھا۔

علامہ کی قبر کے سرہانے جو لوحِ سنگین استادہ ہے۔ اس پر جو رباعی کندہ ہے وہ ہمارے ہر مرض ملی کا علاج ہے۔ فرماتے ہیں۔

نہ افغانیم نے ترک و تتاریم — چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است — کہ ما پروردہ یک نو بہاریم

آج شاعر محوِ خواب ہے۔ لیکن اس کی آواز بلند ہو رہی ہے ملت کا فرض ہے کہ اس آواز پر کان لگائے، اس کی حقیقت کو سمجھے۔ تمام دنیائے اسلام کی گلی گلی اور کوچے کوچے میں اس آواز کو پہنچائے کہ ہم مسلمان ہیں صرف مسلمان ہم کوئی فرقہ نہیں، رنگ و نسل اور ملک و وطن کا اختلاف ہماری سلامیت پر ہرگز اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ یہ نزاعی فتنے اہل غرض کی پیداوار ہیں۔ اصل اسلام کے نزدیک فرزندانِ اسلام کا باہمی اختلاف تمام حرام اشیاء سے بڑھ کر حرام ہے۔ ہم چھوٹے چھوٹے حراموں میں الجھ کر آپس میں دست و گریباں ہو رہے ہیں اور اس خوفناک ترین حرام سے پرہیز کرنے کا کسی کو خیال تک نہیں آتا۔ جب تک ہم اس حرام کو بے ڈکار ہضم کرتے رہیں گے اسلام سے دور اور کتاب اللہ کے عاصی رہیں گے۔ اور اس دوری و عصیان کا نتیجہ آج تک بہت بری طرح بھگتا اور آئندہ بھی اس بیج کو وہی پھل لگے گا جو ہمیشہ لگتا رہا ہے۔

شاعر حکیم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ کیا وہ لوگ جو ہر سال اس کے کلام کو اپنی متاع گراں بہا سمجھ کر پیش کرتے ہیں اس کے پیغام کی روح سے یونہی کھیلتے رہیں گے؟ کیا وہ طاؤس و رباب کا سب سے بڑا دشمن اسی طرح طاؤس و رباب کا شکار بنا رہے گا؟

اب میں جمرۂ اقبال سے رخصت ہو رہا ہوں۔

سلام! اے روح اقبال تجھ پر ہزاراں سلام!! پروردگار تیری قوم کو توفیق دے کہ وہ صحیح معنی میں تیری قدر کرے اور تو جس منزل کی طرف اس کو لیجانا چاہتا ہے اپنے قافلے کی عنان اُدھر کو موڑے۔ تیرا یہ کہنا ہمارے کانوں سے اتر کر دل میں جاگزیں ہو جائے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

محبت اور زندگی

(جناب حکیم ابوالنظر صاحب رضوی امروہوی)

اگرچہ عام طور پر شاعر اور نفسیات کے ماہرین، محبت کو ضیائی کشش ہی سمجھتے ہیں۔ مگر علامہ اقبال کے نزدیک انسان کا جانشہ محبت اس سے بھی زیادہ قیمت اور بہمہ گیری رکھتا ہے۔ جتنی کہ فلاسفہ کے ہاں۔ . . . زندگی کے ترکیبی عناصر کا باہمی ربط قائم رکھنے کے لئے فلاسفہ بھی محبت کو عظیم ترین توانائی یقین کرتے ہیں۔ لیکن زندگی کے نشو و نما پر اس کی جن اثر اندازیوں کو علامہ مرحوم نے محسوس کیا اس کا جواب شاید ہی کہیں مل سکے۔

ڈاکٹر اقبال محبت کو صرف ایک جذبہ نہیں، کائناتِ ہست و بود سے ٹکرا سکنے کی توانائی کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک محبت زندگی کے جمالیاتی پہلوؤں کا صرف مطالعہ ہی نہیں کرتی رہتی بلکہ زندگی کے مشکلات حل کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد بھی جاری رکھتی ہے۔

ان کے نزدیک محبت کا مادی زندگی کے ہر سرمایہ سے دست کش ہو جانا بے زری و بے پری کی منفی اقدار کو عظمت و برتری سپرد کرنے کیلئے نہیں ہوتا۔ جیسا کہ رہبانیت پرستوں کی تاریخ میں ہوتا رہا۔ بلکہ وہ سب کچھ پانے کے لئے سب کچھ کھوتی اور زرنگار مسند تک پہنچنے کیلئے بوریہ پر قناعت کرتی ہے۔ اس کا مٹانا، پیدا کرنے، بگاڑنا، بنانے اور اس کی تخریب، تعمیر کے لئے ہوتی ہے۔ تخریب پرستوں کی طرح محبت بھی کائناتی قانون کی جکڑبندیوں کو توڑ کر باہر نکل جانا چاہتی ہے مگر اس کا نکراؤ نتائج سے بے خبر اور خواب پریشاں کی طرح بے تعبیر نہیں ہوتا — زندگی کے جو حسین و جمیل پیکر خاک کے ذرے کی طرح منتشر ہوتے ہیں، محبت ان ہی سے نئی زندگی اور نئی دنیا تیار کر لیتی ہے۔

عشق بہ سرکشیدن است شیشۂ کائنات را   جامِ جہاں نما مجو دستِ جہاں کشا طلب
چوں بہ کمال می رسد فقر دلیلِ خسروی است   مسندِ کیقباد را در تہِ بوریا طلب   (زبور عجم ص ۱۶۳)

عشق ازیں گنبدِ در بستہ بروں تاختن است   شیشۂ ماہ ز طاقِ فلک انداختن است
مذہبِ زندہ دلاں خوابِ پریشانے نیست   ازہمیں خاک جہانِ دگرے ساختن است

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم   عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق   شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم   (ص ۱۳۱)

یہ ولولہ، بیتابیِ ذروں اور یہ بے پناہ توانائی نہ صرف نباتات و حیوانات ہی میں پائی جاتی ہے بلکہ جس ذرہ کو بھی توڑا جائے گا اس میں سے محبت   جس کا ردِ عمل، تعمیر کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ بلند و پست کائنات ہو یا انسان کی جبلت۔ اگرچہ ولولۂ محبت دونوں میں پایا جاتا ہے مگر ایک ناقابلِ فراموش تفاوت و امتیاز کے ساتھ۔

ستارے بھی رات دن گردش کرتے اور شب و روز کے مثبت و منفی پہلوؤں کو سامنے لاتے رہتے ہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہو گا کہ

[illegible]

برش تیل بھی ہے اور ... نصیب نہیں ہوتا جو انسانی محبت کے ایک تصادم اور اندرونی توانائی کے ایک ہی مظاہرہ سے ٹھوس سچائی میں تبدیل ہو سکتا تھا۔

برنگِ لالہ رنگ آمیزیٔ عشق — بہ جانِ ما بلا انگیزیٔ عشق

(پیام مشرق ۱۳۰)

(پیام مشرق ۱۳۱)

[illegible]

بھی شکست ... دینے کے لئے محبت کو ایسی ہی ہمہ سے بھی کام لینا پڑتا ہے جو چاند و سورج

[illegible]

ہوتے ہیں لیکن انسانی محبت ... نجات و مرگ کا کوئی

پرزہ آسانا ... ہو جاتا۔

(ارمغانِ حجاز ۲۱۶)

(ارمغانِ حجاز ۲۱۶)

(پیام مشرق ۱۵۹)

لیکن خود انسانی محبت کے تقاضے ... (پیام مشرق ...)

لیکن خود انسانی محبت کے تقاضے اور اس کی پرجوش مانگیں انقلاب چاہتی ہیں۔ اس لئے اس کا طرزِ عمل بھی واعظِ محراب و منبر سے

مختلف ہو جاتا ہے۔ واعظ گرجتا ہے اور انسانی محبت برستی ہے۔ واعظ کیلئے بہترین مقام ایک "منبر" ہے۔ مگر چونکہ انسانی محبت [illegible] [illegible] اور وہ اس کیلئے رقیب کو آخری سانس تک آزاد چھوڑ دیتا [illegible] مگر جان کی بازی لگا دینے [illegible] ہیں جن کا پروگرام ہی مفاد پرستیوں سے بلند ہو کر اجتماعی زندگی [illegible] مشکل ہو جاتا ہے [illegible] جس میں شریعت و دین اور انسانی شعور و تجربہ [illegible] نظریات اور پروگراموں کے حسین ترین [illegible] ابن مریم نہیں پیدا ہوتا۔ [illegible] قافلہ حجاز [illegible] تباہی کے لئے نہیں پیدا کیا تھا [illegible] مگر چونکہ انسانی محبت "تہ بہ طوفان" [illegible] نہیں ہوتی اس لئے [illegible] چنگاریوں کی طرح "تنگ سنگ" میں پنہاں ہی رہنے پر مجبور ہو جاتی ہیں اور وہ تلوار نیام سے باہر [illegible] سکتی تھی

نہاں اندر دو حرفی سر کار است　　　　مقام عشق منبر نیست دار است
براہیماں ز نمرودان نترسند　　　　که عود خام را آتش عیار است
(ارمغان حجاز ص ۲۶)

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں　　　　گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق　　　　عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات
دانش و دین و علم و فن بندگی ہوس تمام　　　　عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہر بندگی ہے عشق، جوہر عشق ہے خودی　　　　آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگی نیام ابھی

مسلمانوں میں سرمایہ داری اور زمینداری کی ابتدا

تاریخ کی روشنی میں

تاریخ عالم پر جن لوگوں کی نگاہ ہے وہ جانتے ہیں کہ قوموں پر جب کبھی تباہی آئی ہے وہ ان چار گانہ لعنتوں میں سے کسی نہ کسی ایک کی مرہونِ منت رہی ہے۔ ملوکیت۔ برہمنیت۔ سرمایہ داری۔ جاگیرداری (یعنی زمینداری) قرآن کریم کا جن لوگوں نے خالی الذہن ہو کر مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ قرآن ان چاروں لعنتوں کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھا۔ برہمنیت کے آتشکدوں کی آگ اسی سے سرد پڑی ایوانِ ملوکیت کے کنگرے اسی سے سربسجود ہوئے۔ سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کا طلسم اسی سے ٹوٹا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ کچھ ہی عرصہ کے بعد مسلمان پھر آہستہ آہستہ انہی چار گانہ لعنتوں میں گرفتار ہوتا چلا گیا اور جس ذلت و نکبت کے غارِ عمیق سے قرآن نے اس کو نکالا تھا وہ پھر اسی میں جا گرا۔ مگر ظاہر ہے کہ اس میں قرآن یا قرآنی نظام کا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ قصور تھا تو ان لوگوں کا تھا جنہوں نے قرآنی تعلیمات کو دانستہ یا نادانستہ پس پشت ڈال کر دوسری راہیں اپنے لئے اختیار کر لیں۔ سچائی بہرحال سچائی ہے خواہ اس کا ماننے والا کوئی بھی باقی نہ رہے۔

اسلاف پرستی کچھ مسلمان قوم ہی کا شیوہ نہیں۔ دنیا میں ہر تباہ ہونے والی قوم کا یہی طغرائے امتیاز رہا ہے۔ قرآن کریم کے اوراق الٹتے جایئے۔ قوم عاد۔ قوم ثمود۔ قوم فرعون۔ قوم لوط۔ قوم صالح۔ قوم تبع۔ بنی اسرائیل اور آخر میں کفارِ عرب میں جو چیز مشترک نظر آتی ہے ان میں اسلاف پرستی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اور اسی کی یہ وجہ ہے کہ کوئی تباہ ہونے والی قوم یہ جرأت پیدا نہیں کر سکتی کہ وہ اپنے اسلاف کی تاریخ پر بے لاگ تنقید و تبصرہ سے یہ معلوم کر سکے کہ ہمارے بزرگوں نے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائیں۔ اور کہاں کہاں غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے تاکہ وہ آئندہ کے لئے صحیح غور و فکر کے ساتھ اپنی آنیوالی نسلوں کو ان ہولناک غلطیوں سے محفوظ رکھنے کا سامان کر سکے۔ ان تباہ ہونیوالی قوموں کو ماں کی گود سے یہ سبق سکھایا جاتا ہے کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" لہٰذا بزرگوں نے اگر غلطی بھی کی ہے تو دین و ایمان کی سلامتی اسی میں سمجھی جاتی ہے کہ اندھوں کی طرح بے سوچے سمجھے ان غلطیوں پر اصرار در تکرار اصرار کیا جائے۔ اور اگر کوئی شخص ان بزرگوں کی کسی غلطی کو سامنے لانے کی جرأت کرے، تو اسے غیر مہذب، گستاخ، بے ایمان، منکرِ اسلاف قرار دیکر سرِ بزم مطعون کر دیا جائے۔

آج مسلمان تباہ و برباد ہیں۔ دن بدن ان کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے مگر کسی کو یہ نہیں سوجھتا کہ وہ دیانتداری کے ساتھ یہ سوچنے کی زحمت گوارا کرے کہ آخر یہ تباہی ہم پر کیوں آ رہی ہے اور اس کے وجوہ و علل کیا ہیں اور ان اسباب و وجوہ سے آئندہ محفوظ رہنے

کی سبیل کیا ہو سکتی ہے۔

قرآن کریم کی راہنمائی کے بموجب جب کبھی کسی قوم پر تباہی آتی ہے تو اس کا سبب اس قوم کے بڑے لوگوں (مُترَفِین) کی خرابی ہوتی ہے۔ یہ بڑے لوگ کون ہوتے ہیں؟ یہ وہی امراء و سلاطین (ملوکیت) رؤساء و اشراف (جاگیردار) علماء و احبار (برہمن) مالدار دولت مند (سرمایہ دار) لوگوں کا طبقہ ہوتا ہے۔ کسی قوم کی تباہی میں کبھی ان سب کا ہاتھ ہوتا ہے اور کبھی ان میں سے چند ایک کا۔ بہرحال ہوتے یہی ہیں۔

قرآن کریم کے اس اصول کی روشنی میں ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ کہیں ہم میں بھی یہ طبقات تو نہیں پیدا ہو گئے تھے جو پوری قوم کو لے ڈوبے ہوں، اور اگر پیدا ہو گئے تھے تو کب اور کہاں پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت ہم صرف سرمایہ داری اور زمینداری سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ ملوکیت اور ملائیت سے کسی دوسرے وقت بحث کی جائے گی۔ اگر ہمیں اس تباہی کے سرچشموں کا سراغ لگانا ہے تو یقیناً ہمیں پوری احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے اس تاریخی ذخیرہ ہی کو کھنگالنا ہوگا۔ جہاں تک دین کا تعلق ہے ہمیں اپنے تاریخی ذخیرہ کی طرف جانے کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ اس باب میں ہمارے پاس ایک یقینی ذریعۂ علم یعنی خدا کی کتاب موجود ہے لیکن جہاں تک ہماری قومی تاریخ اور ملتِ اسلامیہ پر بعد میں پیش آنے والے حادثات کا تعلق ہے اس تاریخی ذخیرہ سے استفادہ کے سوا ہمارے پاس کوئی دوسرا ذریعۂ علم موجود نہیں ہے جو درحقیقت مستند اور یقینی ہو۔

اس حقیقت کو ہم بارہا ظاہر کر چکے ہیں کہ قرآن کریم اسلامی نظام کے متعلق ہمیں اصول دیتا ہے اور باستثنائے چند بہت کم تفصیلات جزئیات کی تعیین کرتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کا نظامِ مملکت چونکہ خدائی ہے اسلئے مرکزِ ملت کے لئے وہ اتنی آزادی چھوڑتا ہے کہ قرآنی اصول و حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مدنظر ہر عہد کا مرکزِ ملت تفصیلات و جزئیات کی تعیین خود کرے۔ صدرِ اول میں اسی پر عمل ہوتا رہا اور خلفائے راشدین اسی اصول کی پیروی کرتے رہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جہاں تک حضرات خلفائے راشدین کے عہد کا تعلق ہے انہوں نے متعدد مسائل میں جو تفصیلات و جزئیات متعین کیں وہ اپنی صوابدید کے مطابق ملت کی بہبودی اور بہتری کو نظر رکھتے ہوئے اصحابِ حل و عقد سے مشورہ اور استصواب کے بعد متعین کیں۔ لیکن بہرحال یہ حضرات بھی انسان ہی تھے، فرشتے نہیں تھے۔ ان کے اجتہاد میں جہاں صحت و صواب کا احتمال ہے وہاں سہو اور غلطی کا بھی امکان ہے جو تقاضائے بشریت ہے۔ لہٰذا اگر ہم اپنی تحقیق میں ان کی کسی غلطی پر متنبہ ہوتے ہیں تو اس سے ان کی دیانت و امانت، تقویٰ و طہارت پر قطعاً کوئی حرف نہیں آتا۔ اس سے نہ ان کی تنقیص ہوتی ہے اور نہ یہ ہمارا مقصود ہے۔ ان حضرات کا عمل اتنا بلند تھا کہ اس کے سامنے ہماری نگہ تعظیم و احترام ہر وقت جھکی رہتی ہے۔ ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہم تاریخی استقصاء سے اس غلطی تک پہنچ جائیں جس سے ہماری غلط روی کی ابتداء ہوئی تھی تو ہم اپنی اور آنے والی نسلوں کی بہتری اصلاح کر سکیں۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کا یہ وقت نہیں ہے۔ اسے ہم کسی دوسرے وقت کے لئے چھوڑتے ہیں فی الحال ہم تفصیلات سے قطع نظر صرف اشارات پر اکتفا کریں گے۔

سرمایہ داری

سورۂ فاتحہ سے لیکر والناس تک پورا قرآن کریم پڑھ جائیے آپ کو جگہ جگہ ملے گا کہ قرابت داروں۔ ضرورت مندوں

عرصہ اڑھائی سال سے زیادہ متجاوز نہ ہو سکا جو زیادہ تر اندرونی خلفشار کے فرو کرنے میں ختم ہو گیا۔ آئندہ آنے والی فتوحات کی راہ کھلی

عرصہ اڑھائی سال سے زیادہ متجاوز نہ ہو سکا جو زیادہ تر اندرونی خلفشار کو فرو کرنے میں ختم ہو گیا۔ [illegible] فتوحات کی [illegible]
[illegible] نے دیکھا آپ
[illegible] تقسیم [illegible] حضرت [illegible]
[illegible] تمام اموال کو تقسیم کر دیا جائے [illegible] حضرت عمر
اس [illegible] برابر [illegible]
[illegible] قیام بیت المال [illegible] ایک دفتر [illegible] کرنے کی [illegible]
[illegible] قائم کیا گیا اور ایک [illegible] تقسیم [illegible] کیا گیا جس میں تمام مسلمانوں کے
نام درج کئے گئے [illegible] تمام مسلمانوں میں [illegible] تقسیم [illegible] شامل تھے [illegible] رائے دی کہ
[illegible] تقسیم [illegible]
[illegible] تقسیم [illegible] لوگوں کو [illegible]
[illegible] کے برابر نہیں کر سکتا جو طویل عرصہ تک رسول اللہ سے برسرپیکار رہے اور آخر میں
مجبور ہو کر مسلمان ہو گئے [illegible] حضرت صدیقؓ اور عمر فاروقؓ میں اختلاف ہو چکا تھا۔ ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی تقسیم
[illegible] تقسیم
[illegible] اسلام [illegible]
[illegible] اسلام میں
[illegible]
[illegible] جن کا اجر حق تعالیٰ جل شانہٗ دیگا۔ یہ مسئلہ معاش کا مسئلہ ہے۔ اس میں ترجیح و امتیاز
کے بجائے [illegible] جوں جوں وسعت و فراغت کے سرچشمے بڑھتے گئے مسلمانوں پر خراج [illegible] بھی بقدر مساوی
بڑھتی رہی [illegible]
[illegible] لوگ
رسول اللہ صلعم سے [illegible] رہے ہیں میں انھیں ان صحابہ کے برابر [illegible]
پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر کئے [illegible] جنگ [illegible]
[illegible] ہزار درہم سالانہ مقرر کئے [illegible]
[illegible]
گئے یعنی اتنا ہی جتنا ان کے والد (حضرت علیؓ) کے لئے تھا۔ پھر جو لوگ فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے ان کے لئے تین تین ہزار

اور فتح مکہ کے وقت مسلمان ہونے والوں کے لئے دو دو ہزار اور انصار و مہاجرین کے نو عمر لڑکوں کے لئے بھی دو دو ہزار۔ اور سب لوگوں کے لئے ان کے مرتبہ کے مطابق۔ قرأت قرآن اور خدمات جہاد کو مدنظر رکھتے ہوئے مقدار وظائف کی تعیین کی۔ چنانچہ اہل یمن اور اہل شام و عراق کے لئے دو ہزار سے لیکر ایک ہزار نو سو پانچ سو اور تین سو درہم تک مقرر کئے اور کسی کا حصہ تین سو سے کم نہیں رکھا اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر خدا نے اور زیادہ مال دیا تو میں ہر شخص کے لئے کم از کم چار ہزار درہم سالانہ مقرر کردوں گا۔ ایک ہزار سفر کیلئے۔ ایک ہزار جنگی اسلحہ کے لئے۔ ایک ہزار گھر والوں کے لئے اور ایک ہزار اپنے گھوڑے اور خچر کے لئے۔ . . . . . تقسیم مال کے بارہ میں بہرحال یہ دو رائیں تھیں۔ ابوبکرؓ کی رائے اور عمرؓ کی رائے۔ عمرؓ کی رائے کے لئے یہی دلیل تھی کہ "میں ان لوگوں کو جو رسول اللہ صلعم سے برسرپیکار رہے ہیں ان صحابہؓ کے برابر نہیں کرسکتا جو رسول اللہؐ کے ساتھ ہو کر عمر بھر مشغول جہاد رہے ہیں۔ ہر آدمی اور اسلام کے لئے اس کی قربانیوں کا احترام کرنا ہی ہوگا۔ اس رائے کی اصل اسلام میں موجود تھی۔ یعنی کوشش اور مشقت کے مطابق اس کا اجر اور بدلہ ہونا چاہئے۔ اور ابوبکرؓ کی رائے کی دلیل یہ تھی کہ یہ لوگ اللہ کے لئے اسلام لائے تھے۔ اس کا اجر تو وہی دے گا۔ تقسیم اموال کا معاملہ ایک معاشی معاملہ ہے جس میں ہمیں مساوات ہی برتنی چاہئے۔

ہمیں اس میں قطعاً کوئی تردد نہیں ہے کہ ابوبکرؓ کی رائے زیادہ پسندیدہ اور روح اسلام کے زیادہ قریب تھی جس سے مسلمانوں میں مساوات قائم رہتی جو اسلام کا ایک بڑا بنیادی مسئلہ ہے۔ اس طرح وہ خوفناک نتائج پیدا نہ ہوتے جو اس تفاوت سے پیدا ہوئے کہ ایک فریق مالدار سے مالدار تر بنتا چلا گیا اور یہ دولت مندی روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی۔ . . . . . یہی وہ نتائج تھے جنہیں آخر عمر میں حضرت عمرؓ نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا اور یہ قسم کھائی تھی کہ اگر وہ ایک سال اور زندہ رہ گئے تو عطایا میں مساوات قائم کردیں گے اور فرمایا تھا (جو بہت مشہور ہے) کہ جو بات بعد میں سمجھ میں آئی ہے اگر کاش پہلے سے سمجھ میں آجاتی تو میں دولتمندوں سے ان کے زیادہ اموال چھین کر فقراء میں تقسیم کردیتا۔ لیکن افسوس صد افسوس وقت گذر گیا اور زمانہ حضرت عمرؓ پر سبقت لے گیا۔ اور اس کے وہ دردناک نتائج سامنے آئے جس نے اجتماع اسلامی کے توازن کو ہمیشہ کے لئے زندہ درگور کر دیا۔ چنانچہ آنے والے فتنوں کا باعث یہی عدم توازن . . . . . حضرت عمرؓ اپنے آخری عہد میں طے فرما چکے تھے کہ وہ ابتدائی عہد اسلام کے طریقۂ اموال کی طرف رجوع فرمالینگے مگر اسلام کی بدقسمتی کہ وہ جلد ہی شہید کردیئے گئے اور جو عزم صمیم فرمایا تھا اسے پورا نہ فرما سکے ——— وہ ایک ارادہ کو بھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے ——— پہلا ارادہ تھا کہ دولت مندوں سے ان کی زیادہ دولت چھین کر ضرورت مندوں میں تقسیم کردیں کیونکہ ان کے عہد خلافت میں اکثر لوگوں کے پاس عطایا میں تفریق و امتیاز کی پالیسی کی وجہ سے دولت کے انبار جمع ہو چکے تھے اور دوسرا ارادہ یہ تھا کہ عطایا میں آئندہ سے مساوات قائم کردی جائے۔

العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام (ص ۲۰۵-۲۰۸)

ہم اس باب میں تو علامہ قطب سے متفق نہیں کہ مسلمانوں میں سرمایہ داری کا تہامو جب حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ تھا۔ اس کے بنیادی اسباب ذرا آگے چل کر سامنے آئیں گے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس فیصلہ سے بھی بعض مقامات پر دولت ضرورت سے زیادہ جمع ہونے لگ گئی تھی۔ چنانچہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، کچھ وقت کے بعد خود حضرت عمرؓ نے بھی اسے محسوس فرمالیا تھا۔ حضرت عمرؓ کی زندگی نے ایفاء نہ کیا کہ وہ اپنے ہی فیصلہ کو بدل دیتے۔ بعد میں حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں حالات بہت زیادہ خراب ہوگئے ایسے خراب کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلیفہ بننے کے ساتھ ہی سب سے پہلے اس طرز تقسیم کے فوراً بدل دینے کا اعلان کرنا پڑا۔ ان کے اعلان کے الفاظ یہ ہیں:

اصحاب رسول اللہ صلعم میں سے جو مہاجرین و انصار یہ سمجھتے ہوں کہ انھیں شرف صحبت کی وجہ سے دوسرے لوگوں پر فضیلت ہے تو خیال رہے کہ ان کی یہ فضیلت خدا کے ہاں ہے اور اس کا اجر خدا کے ہاں ہی ملے گا۔ یاد رہے کہ جن لوگوں نے اللہ اور رسولؐ کی دعوت پر لبیک کہا، ہماری ملت کی تصدیق کی، اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر لیا (مسلمان ہوگیا) اس نے اسلام کے تمام حقوق وحدود کو حاصل کر لیا۔ تم سب اللہ کے بندے ہو۔ اور یہ مال اللہ کا مال ہے جو تم سب پر برابر سرابر تقسیم کیا جائے گا۔ کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ تقویٰ شعار لوگوں کیلئے اللہ کے نزدیک بہترین جزا ہے (العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام ص۲۰۸)

ہم ان حضرات کی نیتوں کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے بھی ان نتائج سے کسی طرح بھی انکار نہیں کر سکتے جو اس پالیسی سے پیدا ہوئے ذرا تصور فرمایئے اس زمانہ کا جس زمانہ کی یہ بات ہے۔ خیال کیجئے عرب کے سادہ تمدن کا جس میں یہ حضرات زندگی بسر کرتے تھے۔ بچہ بچہ کا وظیفہ بیت المال سے مقرر تھا۔ آج کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے تو آج ہی سے اس بچہ کا وظیفہ بھی مقرر ہوگیا ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ کی اس نگرانی کو بھی ذہن میں رکھئے جو وہ اپنی رعایا پر رکھتے تھے۔ عمال حکومت تک کو اس کی اجازت نہیں تھی کہ وہ باریک کپڑا پہن سکیں اور عیش و تنعم کی زندگی بسر کر سکیں۔ عرب کی سادہ زندگی بسر کرنے پر سب لوگ مجبور تھے۔ مگر اس کے ساتھ ہی پانچ پانچ ہزار درہم ایک ایک شخص کے نام پر چلے آرہے تھے۔ ان بیش قرار رقوم کو خرچ کہاں کیا جاتا ہوگا۔ زمینیں اور جائدادیں خریدی نہیں جا سکتی تھیں۔ اونچے اونچے محلات تعمیر نہیں کئے جا سکتے تھے (یہ چیزیں آگے آرہی ہیں) بیوی بچوں پر یہ دولت کے انبار خرچ نہیں ہوتے تھے کیونکہ ان کی ضروریات کے لئے الگ بیت المال سے وظائف مقرر تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ رقمیں جمع ہو رہی تھیں اور دن بدن ان میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ان کی کڑی نگرانی کی وجہ سے وہ مفاسد ظاہر نہیں ہو سکے جو دولت کی فراوانی سے ظاہر ہونا ناگزیر تھے۔ مگر حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں ان کی طبعی نرمی کی بدولت جونہی نگرانی کی وہ طنابیں ڈھیلی پڑیں مفاسد نے سر ابھارنا شروع کر دیا۔

مسلمانوں کی بدقسمتی سے اس عدم توازن اور باہمی تفریق و امتیاز کی چونکہ نسبت بہت بزرگ تھی یعنی حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے عہد خلافت کی سند اس کو حاصل تھی اس لئے یہ دین بن گئی اور آج تک دین بنی چلی جا رہی ہے حالانکہ اس کے مقابلہ میں مالی توازن اور معاشی مساوات کو خود رسول اللہ صلعم اور صدیق اکبرؓ اور حضرت علیؓ کی سند حاصل ہے جو اس سند سے کہیں زیادہ مستند ہے مگر جب انسان کے دماغ پر خود غرضیاں سوار ہو جاتی ہیں تو وہ ہمیشہ اپنے مطلب کی باتیں ہی تلاش کیا کرتا ہے

حالانکہ اس معاشی تفریق و امتیاز کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے پیشروؤں کے خلاف ایک نیا تجربہ فرمایا تھا جو نتائج کے اعتبار سے مضر ثابت ہوا۔ ان مضر نتائج کو حضرت عمرؓ نے خود ہی محسوس بھی فرما لیا اور اس کو موقوف کر دینے کا ارادہ بھی کر لیا۔ زندگی نے ساتھ نہ دیا اور وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کو چاہیے تھا کہ وہ اس کو موقوف کر دیتے مگر انھوں نے اسے موقوف نہیں کیا۔ تا آنکہ نتائج بد سے بدتر ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا اور حضرت علیؓ نے زمام اختیار اپنے ہاتھ میں لیتے ہی اس کو فوراً منسوخ کر دیا۔ اب آپ خود ہی سوچئے اور فیصلہ کیجئے کہ قابل تقلید نمونہ ان میں کونسا ہونا چاہیے۔ معاشی مساوات کا یا معاشی امتیازات کا؟

زمینداری اور جاگیرداری

قرآن کریم اور روایات سے اگر دیکھا جائے تو یہ امر نہایت وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے کہ اسلام میں مروجہ زمینداری و جاگیرداری نظام کے لئے قطعاً کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام میں انفرادی ملکیت کا تصور موجود ہے بھی یا نہیں ۔ اگر ہے تو اس کی حیثیت کیا ہے؟ نیز اس امر کو بھی دیکھنا ہوگا کہ اسلام انفرادی ملکیت کو جائز رکھتا ہے تو کیا بلا تخصیص و تحدید ہر قسم کی چیزوں میں اس کو جائز رکھتا ہے یا اس ضمن میں کچھ حدود و قیود عائد کرتا ہے ـــــ اس میں کچھ مستثنیات تو نہیں ہیں ـــــ قرآن کریم کی ہدایات اس باب میں کس قدر واضح ہیں سر دست ہم اس سے بحث نہیں کریں گے کیونکہ قرآن کی رو سے اسلام کا نظام ربوبیت کیا ہے۔ اس موضوع پر ایک تفصیلی تصنیف محترم پرویز صاحب کے زیر ترتیب ہے جس سے اس کے تمام گوشے نکھر کر سامنے آجائیں گے۔ اس فرصت میں ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہم سے پہلے اور حضرات اس موضوع پر کیا کچھ لکھ چکے ہیں اور ان کے نتائج فکر اس باب میں کیا ہیں؟

اس موضوع پر ہم سب سے پہلے مصر کے مشہور مفکر علامہ سید قطب کا خیال پیش کرتے ہیں جو انھوں نے اپنی کتاب العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام میں بیان کیا ہے (یہ وہی کتاب ہے جس کے اقتباسات اوپر دیئے جا چکے ہیں) ان کی اس بحث کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے بعض اموال میں انفرادی ملکیت کے حقوق کو تسلیم کیا ہے مگر اس کے لئے کچھ حدود اور قیود عائد کی ہیں ساتھ ہی کچھ ایسے اموال بھی ہیں جن کے لئے اسلام انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم نہیں کرتا۔ مگر جن اموال میں اسلام انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتا ہے اس کی حیثیت بھی عینی ملکیت کی ہرگز نہیں ہے بلکہ اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو فرد کی حیثیت ان اموال میں بھی جماعت کی طرف سے یک گونہ وکیل کی سی ہے۔ ورنہ مال علی العموم جماعت ہی کی ملکیت میں داخل ہے اور جماعت بھی در اصل حقیقی مالک نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی طرف سے نیابتہً اس میں تصرفات کرنے کا حق رکھتی ہے ورنہ ہر چیز کا مالک حقیقی سوائے خدا کے اور کوئی نہیں ہے۔

قرآن کریم نہایت وضاحت کے ساتھ اس اصل عظیم کو واضح کر دیتا ہے چنانچہ سورۂ حدید میں ہے۔

امنوا باللہ ورسولہ وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ (۵۷)

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جن اموال میں اس نے تمہیں خلیفہ بنایا ہے ان کو مصالح عامہ کیلئے کھلا چھوڑ دو

اس آیت میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ جو معنی ہم نے اس سے سمجھے ہیں اس کیلئے یہ نص صریح ہے کہ انسان کے ہاتھ میں جو اموال ہیں وہ دراصل خدا کے اموال ہیں اور انسان ان اموال میں وکیل ہے، اصیل نہیں ہے۔ ایسے ہی سورۂ نحل میں جہاں مکاتبین (وہ غلام جو مکاتبت کرکے آزادی حاصل کرنا چاہیں) کی امداد و اعانت کا حکم دیا گیا ہے وہاں حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

وآتوهم من مال الله الذي آتاكم (۲۴/۳۳)

اور ان مکاتبین کو خدا کے اس مال میں سے دو جو اس نے تمہیں دیا ہے۔

یہاں دیکھئے کہ مالدار لوگ ان مکاتبین کو اپنا مال نہیں دیتے ہیں بلکہ اللہ کا مال دیتے ہیں۔ دینے والے محض درمیان کا واسطہ بنتے ہیں تیسری آیت جو سورۂ نور کی ہے وہ ان سے بھی زیادہ صریح ہے۔

والله فضل بعضكم على بعض في الرزق، فما الذين فضلوا برادي رزقهم على ما ملكت ايمانهم فهم فيه سواء۔ افبنعمة الله يجحدون (۱۶/۷۱)

خدا نے تحصیل رزق کے ضمن میں بعض کو بعض سے زیادہ صلاحیتیں دی ہیں۔ لہٰذا جو لوگ زیادہ مال کما سکتے ہیں وہ اپنے زیردستوں کیلئے جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس طرح وہ کچھ اپنا رزق ان پر نہیں لوٹاتے کیونکہ ان اموال میں یہ اور وہ سب برابر کے حقدار ہیں۔ کیا وہ خدا کی نعمت سے انکار کرنا چاہتے ہیں؟

یہاں قرآن کریم نے یہ چیز ثابت کر دی ہے کہ دولت مند لوگ اپنے ہاتھ کے نیچے کے لوگوں کو جو کچھ دیتے ہیں وہ دراصل ان مالداروں کے مال کا کوئی حصہ نہیں ہوتا جو وہ ان ضرورتمندوں کو دیتے ہوں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ دراصل خود ان کا اصلی حق ہوتا ہے جسے یہ لوگ پورا کرتے ہیں، کیونکہ اس مال میں وہ اور یہ سب برابر ہیں۔ ان میں سے ہر گروہ دوسرے کے مثل حقدار ہے کیونکہ مال کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ جو کچھ یہ لوگ لیتے ہیں اس میں ان کا حق ایسا ہی ہے جیسے ان لوگوں کا جو دیتے ہیں۔ اس کے بعد سوال انکاری ہے کہ کیا یہ لوگ خدا کی نعمت کا انکار کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ مال جو ان کے قبضہ میں ہے درحقیقت ان کی اپنی ملکیت تو نہیں ہے بلکہ خدا تعالیٰ کا تفضل و انعام ہی تو ہے۔

اس سے بھی زیادہ صریح قرآن کا وہ حکم ہے جو سورۂ نساء میں موجود ہے جس سے انفرادی ملکیت کی حقیقت بالکل ہی واضح ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ملکیت کہتے کسے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد تصرف اور انتفاع کی ملکیت ہی ہے اگر کسی کو کسی مال میں تصرف اور انتفاع کا حق نہیں تو وہ اس کا مالک نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بعد دیکھئے کہ قرآن کریم ہر فرد کو اپنے اموال میں تصرف کا حق نہیں دیتا بلکہ اس کے لئے صلاحیت تصرف کی شرط عائد کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص تصرفات میں حماقت و سفاہت کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے تو ولی یا جماعت اس کے حق تصرف کو واپس لے سکتی ہے۔

ولا تؤتوا السفهاء اموالكم[1] التي جعل الله لكم قياما وارزقوهم فيها واكسوهم (۴/۵)

اور سفیہ لوگوں کو تم اپنے اموال نہ دو جنہیں خدا نے تمہارے لئے قیام کا باعث بنایا ہے بلکہ اس میں انہیں کھانے پہننے کے بقدر ہی دو۔

---

[1] یہاں اموالکم کا لفظ مزید دعوتِ فکر دے رہا ہے۔ سفہاء کے اموال کو قرآن ان کے اموال قرار نہیں دیتا بلکہ (اموالکم) جماعت کے اموال قرار دیتا ہے۔

اس آیت میں یہ امر واضح کر دیا گیا ہے کہ تصرف کا حق انسان کو اسی وقت مل سکتا ہے جبکہ وہ ہوش و خرد کے ساتھ اس فرض کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر کسی مالک میں یہ صلاحیت نہیں ہے تو ملکیت کے طبعی ثمرات یعنی حقوق تصرف موقوف ہو جاتے ہیں۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جس شخص کا کوئی بھی وارث نہ ہو تو امام ہی اس کا وارث ہوتا ہے یعنی وہ جماعت کا مال ہے جس پر فرد کو قبضہ حاصل تھا۔ جب اس کے بعد وہ منقطع ہو جاتا ہے تو مال اپنے اصلی سرچشمہ کی طرف لوٹ آتا ہے۔

یہ چیز واضح طور پر سمجھ لینی چاہئے کہ فرد کے اندر یہ شعور ہی کہ وہ اس مال میں جو دراصل جماعت کی ملکیت ہے محض جماعت کی طرف سے نائب یا وکیل ہے۔ ان فرائض کو قبول کرنے پر مجبور کر سکتا ہے جو ایک نظام اس کی گردن پر کرتا ہے اور ان قیود کو منوا سکتا ہے جس سے وہ اس کے تصرفات میں حد بندیاں لگاتا ہے۔ ساتھ ہی جماعت کا یہ شعور کہ وہی اس مال کی اصلی مالک ہے، جماعت کو فرائض عائد کرنے اور حدود قائم کرنے کی جرأت دلا سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام میں عینی ملکیت کی تو کوئی قیمت ہی نہیں بلکہ بعض اموال میں تو درحقیقت اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر زمین کو لے لیجئے۔ عقل اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ کوئی انسان خود زمین کا مالک ہو سکتا ہے۔ انسان دراصل اس کی پیداوار اور غلہ کا مالک ہوتا ہے نہ کہ خود زمین کا۔ تو اعتبار محض انتفاع کا ہے نہ کہ عینی ملکیت کا۔

اس کے بعد ایک اور بنیادی مسئلہ پر بھی غور فرمائیے کہ اسلام مال سے انتفاع کے لئے بھی اس کا روادار نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے ایک خاص گروہ میں قید ہو کر رہ جائے کہ ہر پھر کر انھیں میں گھومتا رہے اور دوسرے لوگ اس کو نہ پا سکیں۔ سورۂ حشر کی اس آیت پر غور فرمائیے۔

کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم (۵۹/۷)

تاکہ مال تم میں سے صرف دولتمندوں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔

اس نص کے ساتھ ایک اور متعلق ہے جسے سمجھ لینے سے آیت کو سمجھنے میں ہمیں سہولت ہوگی۔

آپ کو معلوم ہے کہ مکہ مکرمہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مہاجرین نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی، جو تنگدست تھے وہ اپنے ساتھ کیا مال لیکر آتے لیکن جو دولتمند تھے وہ بھی اپنا مال ساتھ نہیں لا سکے۔ لہٰذا دوسرے تنگدستوں کی طرح یہ بھی تنگدست ہی تھے۔ انصار نے انتہائی سخاوت کا مظاہرہ کیا اور اس بخل سے اپنے آپ کو بلند کر کے دکھا دیا جو انسانی نفس میں پوشیدہ ہے۔ انھوں نے ان مہاجرین کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم کئے اور ہر اس چیز میں جو ان کی ملکیت میں تھی ان کو برابر کا شریک کر لیا، حتیٰ کہ مخصوص ترین اشیاء تک میں بھی۔ یہ سب کچھ انھوں نے کسی جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ نہایت خوش دلی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ کیا۔ سورۂ حشر میں ہے۔

یحبون من ھاجر الیھم ولا یجدون فی صدورھم حاجۃ مما اوتوا ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ (۵۹/۹)

جو لوگ ان کی طرف ہجرت کر کے آئے ہیں انصار ان سے محبت کرتے ہیں اور جو اموال ان کو دیئے گئے ہیں ان کو مہاجرین کے

حوالہ کردینے سے اپنے سینوں میں تنگی محسوس نہیں کرتے، بلکہ اپنی ضرورتوں پران کی ضرورتوں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ درحقیقت وہ خود ان چیزوں کے انتہائی محتاج ہیں ۔

صحیح اعتقاد انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے حضرات انصار رضی اللہ عنہم اجمعین اس کا ایک کامیاب نمونہ تھے ۔

گر مدینہ منورہ کے مالداروں اور فقراء مہاجرین میں پھر بھی عدم توازن کی ایک خلیج حائل تھی، نبی صلعم انصار کی سخاوت اور دریا دلی کو دیکھ رہے تھے لہٰذا آپ اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے کہ جو کچھ وہ خود ہی کر رہے ہیں اس سے زیادہ کا ان سے مطالبہ کریں۔ تاآنکہ واقعہ بنی نضیر پیش آیا جس میں جنگ نہیں ہوئی۔ اس کا تمام فیٔ، اللہ اور رسول (مرکزِ ملت) کی ملکیت قرار پایا۔ اس وقت حضور کی رائے ہوئی کہ مسلمانوں کی جماعت میں مالی اعتبار سے کسیقدر توازن قائم کردیں چنانچہ بنی نضیر کا تمام فیٔ خصوصیت کے ساتھ مہاجرین ہی کو عطا کیا گیا۔ انصار میں سے فقط دو آدمی تھے جنھیں اس میں حصہ دیا گیا تھا کیونکہ وہ دونوں واقعی ضرورتمند تھے۔ اس واقعہ کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے :-

ما افاء اللہ علیٰ رسولہ من اھل القریٰ، فللہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل۔ کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم۔ وما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا، واتقوا اللہ۔ ان اللہ شدید العقاب ۔للفقراء المھاجرین الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم یبتغون فضلاً من اللہ ورضواناً، وینصرون اللہ ورسولہ۔ اولٰئک ھم الصادقون (۷-۸) مختلف آبادیوں کے جو اموال بطور فیٔ کے حاصل ہوں وہ صرف اللہ اور رسول (مرکز ملت) اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہیں۔ یہ حکم اس لئے ہے تاکہ دولت تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتی رہے (بلکہ معاشرہ میں مالی توازن قائم رہے) لہٰذا رسول جو کچھ تمہیں دیدے وہ لیلو، جو نہ دے اس سے باز رہو اور تقویٰ شعار بنو۔ یاد رکھو، خدا کا عذاب (نافرمانوں کیلئے) بڑا ہی سخت ہے۔ یہ اموال فیٔ صرف ان ضرورتمند مہاجرین کیلئے ہیں جن کو اپنے شہروں اور اموال و دولت سے بے دخل کر کے نکال دیا گیا ہے۔ وہ خدا کے فضل و رضا کے طالب اور خدا کے (دین) اور رسول کے (مشن کے) مددگار ہیں۔ یہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں ۔

رسول اللہ صلعم کا اموال بنی نضیر میں یہ تصرف کہ انھیں صرف مہاجرین ہی میں تقسیم کرنا۔ قرآن کی طرف سے اس تصرف کی تصدیق و تائید اور پھر اس کی علت بیان کرنا کہ ایسا اسلئے ہے تاکہ دولت صرف چند دولت مندوں ہی میں سمٹ کر نہ رہ جائے کہ صرف ان کے درمیان ہی گردش کرتی رہے، مسئلہ کی حقیقت کو بالکل واضح کردیتا ہے جس کے مزید بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کہ صراحۃً یہ اصول مستنبط ہوجاتا ہے کہ اسلام بنیادی طور پر اس کے خلاف ہے کہ دولت جماعت کے اندر چند ہاتھوں میں محبوس ہو کر رہ جائے اس کے برعکس اسلام کا منشا یہ ہے کہ جماعت کے مختلف اوضاع میں ایک قسم کا ایسا اعتدال پیدا کردے کہ ملت میں مکمل توازن قائم رہے اور دولت صرف دولت مند لوگوں ہی میں گردش نہ کرتی رہے کیونکہ ایک جہت میں مال و دولت کے انبار جمع ہوجانا اور

دوسری جہت سے بالکل سمٹ جانا بہت بڑے اجتماعی مفاسد کا باعث بن جاتا ہے جس سے جماعت کے مختلف طبقات میں حسد، کینہ، اور بغض و عناد کے جذبات پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ ایسے اموال بھی ہیں جن سے مفاد عام وابستہ ہوتا ہے اور افراد کے لئے ان کو کسی جہت سے بھی اپنے لئے مخصوص کر لینا جائز نہیں ہے چنانچہ رسول اللہ صلعم نے اس قسم کی تین چیزوں کی تصریح فرمادی ہے۔ یعنی پانی۔ چارہ اور آگ۔

الناس شرکاء فی ثلث، الماء، والکلا والنار

تمام لوگ تین چیزوں میں شریک ہیں۔ پانی۔ چارہ اور آگ

چونکہ عرب کے قدیم تمدن میں یہ تین چیزیں حیات اجتماعی کی ضروریات میں شمار ہوتی تھیں لہٰذا ان تینوں چیزوں سے انتفاع حاصل کرنا پوری جماعت کا حق شمار کیا گیا ہے مگر ظاہر ہے کہ اجتماعی حیات کی ضروریات نہ ہر تمدن میں یکساں ہو سکتی ہیں نہ ہر زمانہ میں۔ قیاس، جو تشریع اسلامی کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے اس کی گنجائش رکھتا ہے کہ جو چیزیں بھی اس حکم میں داخل ہوں وہ تطبیق کے وقت اس میں شامل کر لی جائیں۔

اموال کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو جماعت کے صرف ضرورتمندوں ہی کا حق ہے۔ یہ حصہ وہ ہے جو زکوٰۃ کی صورت میں فرض کیا گیا ہے۔

وفی اموالھم حق للسائل والمحروم

اور ان کے مالوں میں سائل و محروم کا حق ہے

یہاں دیکھئے۔ اسلام اس طرح مال کے ایک حصہ کو انفرادی تحویل سے نکال کر اجتماعی تحویل میں لے آتا ہے جس کے مصارف متعین ہیں۔

انما الصدقٰت للفقراء والمسٰکین الآیہ

لہٰذا اسلام میں انفرادی ملکیت کی طبیعی حقیقت کا خلاصہ یہ قانون ٹھہرا کہ مال عموماً جماعت کی ملکیت ہے اور انفرادی قبضہ مالکانہ نہیں بلکہ محض وکالتہً ہے جس کے لئے بہت سی شرطیں اور قیود ہیں۔ نیز بعض اموال کا شمار اموال عامہ میں ہوگا جن پر کسی شخص کی انفرادی تحویل بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ ان انفرادی تحویلوں کا بھی ایک حصہ ایسا ہے جو جماعت کا حق ہے اور جماعت اس حصہ کو افراد سے واپس لیکر ان طبقات پر خرچ کر دیتی ہے جنھیں اس کی ضرورت ہوتا کہ وہ اپنی حالت کو درست کر سکیں اور ان کی حالت کی درستگی سے جماعت کی مجموعی حالت درست ہو سکے۔

[یہ ہے خلاصہ علامہ قطب کی بحث کا]

مذکورہ بالا بحث سے جو نتائج ہمارے سامنے آئے ہیں انھیں ایک مرتبہ پھر دہرا لیجئے تاکہ آگے بڑھنے میں آسانی ہو:۔

(۱) اسلام نے اموال پر انفرادی ملکیت کے حق کو عینی ملکیت کی حیثیت سے قطعاً تسلیم نہیں کیا۔

(۲) جو اموال انفرادی تحویل میں ہوں ان پر افراد کو نائبی حیثیت سے تصرف کا حق رکھتے ہیں ورنہ وہ سب جماعت کی ملکیت ہوتے ہیں۔

(۳) اموال کی دو قسمیں ہیں۔ (الف) جن پر وکالتی تحویل کا حق تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ (ب) جن پر یہ حق بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) جو اموال ایسے ہوں کہ ان سے مفاد عام وابستہ ہو ان پر انفرادی تحویل کا حق تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اب سے چودہ سو سال پہلے عرب کے قدیم تمدن میں حضور اکرم صلعم نے اس ضمن میں تین چیزیں۔ (پانی۔ چارہ۔ آگ) کی تعیین و تخصیص فرمادی تھی۔

(۵) اجتماعی حیات کی ضروریات چونکہ تمام تمدنوں اور تمام زمانوں میں یکساں نہیں ہو سکتیں۔ ان تین چیزوں پر انفرادی تحویل کا حق تسلیم نہ کرنے کی علت چونکہ ان سے مفاد عام کا وابستہ ہونا ہے لہٰذا قیاس کو کام میں لاتے ہوئے اگر کسی دوسرے تمدن یا کسی دوسرے زمانے میں کچھ اور چیزیں ایسی ہوں جن سے جماعت کا عام مفاد وابستہ ہو تو ان کو بھی قیاساً اسی ذیل میں شامل کیا جائے گا۔

مذکورہ بالا نکات پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اگرچہ چودہ سو سال پہلے کے قدیم عربی تمدن میں زمین کو ایسی چیزوں میں شمار نہیں کیا گیا تھا جن سے عام مفاد وابستہ ہوں تو آج قیاس کی بنا پر ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم اپنے تمدن اور اپنے زمانہ کی ضروریات اور تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے زمین کو ان اشیاء میں داخل کر دیں جو انفرادی تحویل میں نہیں دی جا سکتیں کیونکہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ملک کے تمدن کا تقاضا یہی ہے کیونکہ ہمارا ملک ایک زرعی پیداوار کا ملک ہے اور ملک کی زرعی پیداوار سے عام مفاد وابستہ ہیں اور ہمارا یہ فیصلہ کرنا فقہ و تشریع کے بعینہٖ مطابق ہوگا۔

لیکن ایسا فیصلہ کرنے سے پہلے ہمیں دیانتداری کے ساتھ یہ دیکھنا چاہئے کہ رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین کے عہد میں زمینوں کی کیا حیثیت تھی۔ اگر یہ حیثیت خود رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین کے عہد میں بھی مسلم تھی کہ زمین انفرادی تحویل میں نہیں دی جا سکتی کیونکہ اس کے ساتھ بھی جماعت کا عام مفاد وابستہ ہوتا ہے تو ہمیں اپنی طرف سے کسی قیاس کے ذریعہ سے یہ فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

آیئے اب ہم عہد رسالتمآب صلعم اور عہد خلفائے راشدین کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اس عہد مبارک میں مسلمانوں کا طرز عمل کیا تھا اور رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین کی ہدایات اس بارہ میں کیا تھیں۔

عہدِ رسالت و خلفائے راشدین میں زمین کی حیثیت

جیسا کہ معلوم ہے اسلامی نظام کی پہلی تجربہ گاہ سرزمین عرب تھی۔ اگر ہم اس کو اور مختصر کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ مدینہ منورہ کی سرزمین تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ عرب کی سرزمین زیادہ تر سنگلاخ اور ریگستانوں پر مشتمل ہے۔ پانی کی قلت بلکہ میلوں تک نایابی کی بنا پر سرسبزی کہیں دیکھنے کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ پورے جزیرۂ عرب میں طائف کا ایک حصہ ایسا ہے جسے سرسبز کہا جا سکتا ہے۔ مدینہ منورہ میں کھجوروں کے کچھ باغات اور کہیں کہیں جَو کے چند کھیت نظر آ سکتے تھے۔ باغات اور کھیت کے لفظ سے آپ اپنے ذہن میں اپنے ہاں کے باغات اور کھیتوں کا تصور ذہن میں نہ لے آئیں۔ مدینہ منورہ کے باغات ایسے ہی تھے کہ کہیں کہیں کھجوروں کے چند درخت لگا دیئے گئے اور اس کو باغ کہہ دیا گیا۔ مدینہ منورہ کی یہ سرزمین آج بھی زائرین کیلئے وجہ شادابیٔ قلب و نگاہ ہے اس کی زرعی حیثیت ایسی نہیں ہے جس کا آج اندازہ نہ کیا جا سکے۔ یا جو حیثیت اس کو عہد رسالت میں حاصل تھی وہ آج بدل گئی ہو۔ مدینہ منورہ کے دو طرف کالے پتھروں کا وسیع و عریض سنگستان ہے جو حرہ کہلاتا ہے۔ یہ تمام علاقہ زراعت کے ناقابل اور بنجر ہے باقی حصہ ایسا ہے کہ اس میں درخت وغیرہ لگائے جا سکتے ہیں مگر یہ حصہ بھی مسلسل ایسا نہیں ہے کہیں کہیں قابل زراعت ٹکڑے آ جاتے ہیں بہرحال

یہ وہ سرزمین تھی جسے اسلامی نظام کی اولین تجربہ گاہ بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس زمین کا تصور اپنے ذہن میں رکھئے اور سوچئے کہ کیا اس علاقہ اور اس سرزمین کو مثال بنا کر اپنے موجودہ عہد کے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کیلئے وجہ جواز نکالی جا سکتی ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ اس امر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جن لوگوں کے پاس یہ زمینیں تھیں وہ بمشکل خود ان کی ضرورتوں کو پورا کر سکتی تھیں۔ یہ لوگ خود ہی اپنے ہاتھوں سے ان میں کام بھی کرتے تھے۔ زمین کے مالک بنکر کام کئے بغیر زمین سے استفادہ کا طریقہ ان میں عموماً مروج نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مدینہ کو کھیتی باڑی کرنے والے۔ کسان۔ کاشتکار وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا۔ قریش مکہ جو خود کو ایک تاجر قوم کے افراد سمجھتے تھے مدینہ والوں کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتے تھے۔ عام لڑائیوں میں جا رزمت کے وقت قریشی بہادروں نے انصار مدینہ سے دو دو ہاتھ کرنا بھی گوارہ نہیں کیا اور جواب میں یہی کہا کہ ہم ان کسانوں سے مقابلہ کرنے میں اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ ابوجہل کو مرتے دم اگر افسوس تھا تو یہی تھا کہ وہ کسانوں کے لونڈوں کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔ چنانچہ اہل مدینہ کے اس پیشہ کے متعلق صحاح ستہ میں ابوہریرہؓ کا یہ قول موجود ہے

کان یشغلھم عمل اراضیھم

ہمارے انصاری بھائیوں کو اپنی زمینوں پر کام کرنے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔

مدینہ منورہ کے دو اہم قبیلوں اوس و خزرج میں سے قبیلۂ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ کے متعلق امام سرخسیؒ نے نقل کیا ہے کہ

کھیتوں اور نخلستانوں میں کدال اور پھاوڑے پر کام کرنے کی وجہ سے ان کی ہتھیلیوں میں گھٹے پڑ گئے تھے (کتاب المکسب للسرخسی ضمیمہ مبسوط (ج ۳۰ ص ۲۴۵))

جس قوم کے سرداروں کا یہ حال تھا ان کے عوام کا حال معلوم۔ البتہ مدینہ منورہ میں بنو حارثہ کا ایک قبیلہ ضرور ایسا موجود تھا جن کے قبضہ میں اپنی ضرورت سے زیادہ زمینیں تھیں چنانچہ خود اس قبیلہ کے ایک فرد حضرت رافع بن خدیجؓ کا یہ قول بخاری میں موجود ہے

کنا اکثر الانصار مزرعاً۔ (بخاری)

تمام انصار میں سب سے زیادہ زرعی زمینیں ہمارے پاس تھیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قبیلہ کے لوگ اپنی زمینوں کو بٹائی پر دینے کے بھی عادی تھے۔ بہرحال اگرچہ چھوٹے پیمانہ پر ہی سہی مگر زمینداری سسٹم ان کے اندر موجود تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس قبیلہ کے سرآوردہ لوگوں کو طلب فرمایا۔ بخاری میں حضرت ظہیرؓ (رافع بن خدیجؓ کے چچا) کا یہ قول موجود ہے:-

رسول اللہؐ نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ اپنی زرعی زمینوں کے ساتھ تم لوگ کیا کرتے ہو۔

وہاں سے واپس آ کر ظہیر اور ان کے بھائی نے اپنے خاندان کے لوگوں کو جو حضورؐ کا حکم پہنچایا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔ رافع بن خدیج کہتے ہیں:-

میں نے اپنے دونوں چچاؤں (ظہیر اور مہیر) سے سنا جبکہ وہ دونوں اپنے محلہ والوں سے کہہ رہے تھے کہ زمین کو کرایہ پر بندوبست کرنے کی رسول اللہ صلعم نے ممانعت فرما دی ہے۔ (صحاح ستہ)

رافع ابن خدیج اپنے ماموں سے نقل کرتے ہیں:

میرے ماموں ایک دن آئے اور کہا کہ رسول اللہ صلعم نے ایک ایسی بات سے منع فرما دیا ہے جو تم لوگوں کیلئے زیادہ نفع بخش تھی مگر اللہ اور

رسولؐ کی فرمانبرداری ہمارے اور تمہارے لئے کہیں زیادہ نفع بخش ہے۔ رسول اللہ صلعم نے تہائی اور چوتھائی پر اور کرایہ پر زمینیں دینے سے بالکل منع فرمادیا ہے۔ (کنز العمال ص۴۷۳)

شمس الائمہ سرخسیؒ نے امام محمدؒ کے حوالہ سے اسید بن حضیر صحابیؓ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

اے بنو حارثہ والو آج تم پر بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی۔ کرایہ پر زمینوں کا بندوبست کرنے سے رسول اللہ صلعم نے ممانعت فرمادی ہے۔ (مبسوط ج۱۲ ص۲۳)

رافع ابن خدیجؓ کی یہ روایتیں تمام صحاح ستہ میں مختلف الفاظ کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں یہ الفاظ ہیں۔

رسول اللہ صلعم نے زرعی زمینوں کو کرایہ پر بندوبست کرنے سے منع کر دیا ہے۔ (بخاری)

کہیں ان الفاظ میں ہے

رسول اللہ صلعم نے منع فرمادیا ہے کہ زمین کو بندوبست کر کے زمین کے مقابلہ میں کوئی معاوضہ یا کسی قسم کا کوئی حصہ لیا جائے۔ (مسلم وغیرہ)

کہیں یہ تصریحات ہیں

رسول اللہ صلعم سے پوچھا گیا کہ کیا تھوڑا بہت اناج بھی کاشتکار سے زمین کا مالک نہیں لے سکتا؟ فرمایا گیا، نہیں، پھر سوال کیا گیا کہ اچھا غلہ نہ سہی بھوسا تو لے سکتا ہے؟ فرمایا نہیں۔ (نسائی)

کہیں یہ بھی تفصیلات دی گئی ہیں۔

زمین کو چوتھائی، تہائی، یا اناج کی مقررہ مقدار پر بھی بندوبست کرنا جائز نہیں ہے۔ (ابوداؤد و مسند احمد و کنز العمال)

رہ گئی یہ صورت کہ زمین کو نقد رقم کے مقابلہ میں بندوبست کیا جائے تو اس کے متعلق رافع بن خدیجؓ رسول اللہ صلعم سے کچھ نقل نہیں کرتے۔ وہ محض اپنی رائے بیان کرتے ہیں اور ان کی یہ رائے مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔ کبھی وہ فرماتے ہیں:۔

دینار اور درہم کی شکل میں زمین کو کرایہ پر لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ (بخاری)

مگر ساتھ ہی جب ان کے پوتے عمران بن سہل ان سے آکر عرض کرتے ہیں۔

کہ دادا جان! میں نے دو سو درہم پر اپنی زمین کرایہ پر دیدی ہے۔

تو وہ بایں الفاظ ان کو منع فرمادیتے ہیں:۔

اس طریقہ کو چھوڑ دو کیونکہ رسول اللہ صلعم نے زمینوں کو کرایہ پر دینے سے منع فرمایا ہے۔

اس اختلاف رائے کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں نقدی بندوبست کا رواج نہیں تھا اسلئے صراحۃً حضورؐ سے اسکی ممانعت مروی نہیں تھی لہٰذا کبھی وہ یہ خیال کرتے تھے کہ جس چیز سے رسول اللہ صلعم نے صراحۃً منع نہیں فرمایا اس سے ہم کیوں منع کریں اور کبھی وہ اصولی ممانعت کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے منع فرمادیتے تھے۔ بخاری میں موجود ہے کہ رافع بن خدیج سے نقدی بندوبست کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ

سونے چاندی پر بندوبست کرنے کا اس زمانہ میں رواج نہیں تھا۔

بہرحال جہاں رافع ابن خدیجؓ سے اسکی اجازت نقل کی جاتی ہے وہاں کا اپنا قول ہے رسولؐ اللہ کا نہیں۔ رہی یہ بات کہ بعض روایتوں میں رافع ابن خدیج نے اس اجازت کو رسول اللہ صلعم کی طرف بھی منسوب کیا ہے تو اس کے متعلق حافظ ابن حجرؒ نے تصریح کی ہے۔

دراصل راوی کو سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے ورنہ درحقیقت یہ سعید بن المسیب کا قول ہے جسے راوی نے کچھ اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ یہ براہ راست رسول اللہ صلعم کا حکم معلوم ہوتا ہے۔ (فتح الباری ج۵ ص۲۰)

رافع ابن خدیجؓ کے علاوہ اسی مضمون کی حدیثیں دوسرے صحابہ سے بھی مروی ہیں چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے منقول ہے۔

کچھ صحابہ کے پاس زائد از ضرورت زمینیں تھیں۔ پس رسول اللہ صلعم نے فرمایا جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ زمین ہو اسے وہ خود ہی کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو بخش دے یا اپنی زمین کو روکے رکھے۔ (بخاری مسلم)

دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں۔

عطاؒ جابرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ لوگ تہائی چوتھائی اور نصف بٹائی پر زمینیں کاشت کیلئے دیا کرتے تھے۔ اس پر نبی صلعم نے فرمایا جس کے پاس زمین ہو اسے وہ خود کاشت کرے یا کسی کو بخشدے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اپنی زمین کو روک رکھے۔ (بخاری مسلم)

بخاری اور مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے بھی اسی قسم کے الفاظ منقول ہیں۔ اسی مضمون کی روایات حضرت زید بن ثابت اور ثابت ابن الضحاک اور ابوسعید خدریؓ سے بھی نقل کی جاتی ہیں (ملاحظہ ہو مسلم۔ ابوداؤد۔ طحاوی وغیرہ)

یہانتک آپ نے دیکھ لیا کہ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں صورت حالات کیا تھی۔ زمین ہے ہی اسلئے کہ اس سے انسان اپنی غذا پیدا کریں غذا پیدا کرنے کیلئے یہ زمینیں لامحالہ کسی نہ کسی کی تحویل میں ضرور دیجائیں گی ورنہ وہ خودپڑی پڑی غذا اگلنے سے رہیں چنانچہ آپ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو جن لوگوں کے قبضہ میں زمینیں چلی آرہی تھیں آپ نے ان کو انہی کے تحویل میں رہنے دیا کیونکہ عام طور سے لوگوں کے پاس اپنی ذاتی ضرورتوں سے زیادہ زمینیں نہیں ہوتی تھیں اور جن لوگوں کے پاس زمینیں ہوتی تھیں وہ اپنے ہاتھوں سے اس میں کام کاج کرتے تھے۔ مدینہ منورہ میں صرف بنوحارثہ کا ایک قبیلہ ایسا تھا جن کے قبضہ میں اپنی ضرورت سے زیادہ کچھ زمینیں تھیں اور وہ بٹائی پر لوگوں کو زمینیں دیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلعم کو معلوم ہوتا ہے تو آپ اس کو فوراً بند فرما دیتے ہیں۔ بٹائی پر دینے سے بھی اور کسی دوسری صورت میں کرایہ پر دینے سے بھی۔ نقد بندوبست کا اس زمانہ میں رواج موجود نہیں تھا لہذا اسکی ممانعت صراحتہً آپ سے نقل نہیں کی گئی لیکن نھی عن المزارعۃ وغیرہ عمومی ارشادات سے اس صورت کا حکم بھی صاف طور پر معلوم ہو سکتا ہے۔ زمین کو غلہ کی مقدار پر کاشت کیلئے دیا جائے یا روپیہ پیسہ پر روح دونوں جگہ ایک ہی ہے لہذا حکم میں کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔ رافع بن خدیج نقد بندوبست کے متعلق حضور کی ممانعت کی نفی کرتے ہیں جسکی وجہ وہ خود ہی بتا دیتے ہیں کہ آپ کے زمانہ میں اس کا رواج ہی نہیں تھا لیکن جب عملی طور پر خود ان کا پوتا ایسا کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کو اس سے روک دیتے ہیں اور استدلال میں حضور کا وہی عمومی حکم نقل فرماتے ہیں۔

یہ تھا نقشہ حضورؐ کی زندگی میں مدینہ منورہ کی زمینوں کا جس سے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کی بُو بھی نہیں آتی۔

بے محل نہ ہوگا اگر اسی سلسلہ میں واقعۂ خیبر کا تذکرہ بھی کر دیا جائے جو بہت سی غلط فہمیوں کا موجب بنا اور آج تک بنا چلا آرہا ہے۔ چنانچہ اسی واقعہ کا تذکرہ امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

(۲) ابن عمرؓ ہی کی روایت ہے اور عبداللہ بن عباسؓ اور انس بن مالکؓ کی روایات اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ نبی صلعم نے خیبر پر حملہ کیا اس کا کچھ حصہ صلحاً فتح ہوا اور کچھ بزور شمشیر مغلوب ہوا۔ آنحضرتؐ نے آدھے علاقہ کو حکومت کی ضروریات کیلئے مخصوص فرما دیا اور آدھے علاقہ کو ۱۸ قطعات میں تقسیم کر کے ان مجاہدین پر بانٹ دیا جو غزوۂ خیبر میں شریک تھے (یعنی بحساب ۱۰۰ آدمی فی قطعہ) پھر آپ نے ارادہ فرمایا کہ معاہدہ کے مطابق یہودیوں کو وہاں سے نکال دیں۔ مگر یہودیوں نے آکر عرض کیا کہ آپ ہمیں یہاں رہنے دیں ہم آپ کی طرف سے یہاں کاشت کرینگے۔ آدھی پیداوار آپ لے لیجئے گا اور آدھی ہم لیلیں گے۔ آنحضرتؐ نے یہ دیکھکر کہ آپ کے پاس کام کرنیوالے آدمیوں کی کمی ہے ان کی بات مان لی، اور ان سے فرمایا کہ ہم جبتک

چاہیں گے تم کو رکھیں گے اور جب چاہیں گے تمہیں یہاں سے نکال دینگے۔ چنانچہ ان شرائط پر آپ نے ان سے معاملہ طے کر لیا۔ وہ کاشتکاروں کی حیثیت سے خیبر میں کام کرتے تھے۔ آدھی زمین کی مالک حکومت تھی اور بقیہ نصف کے مالک وہ ۱۵ سو حصہ دار تھے جن پر ۱۸ قطعات تقسیم کئے گئے تھے۔ بٹائی کے معاہدہ کی رو سے جو نصف پیداوار وہاں سے آتی تھی اس کو حکومت اور حصہ داروں کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ نبی صلعم کا اپنا حصہ بھی عام حصہ داروں کے ساتھ تھا۔ چنانچہ آپ اس میں سے ہر سال ایک خاص مقدار میں غلہ اور کھجوریں اپنی ازواج مطہرات کو برابر برابر دیا کرتے تھے۔ یہ بندوبست حضورؐ کے آخر حیات تک جاری رہا۔ اسی پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں عمل کیا۔ اسی پر حضرت عمرؓ اپنے ابتدائی زمانہ میں کاربند رہے۔ پھر جب یہودیوں نے خیبر میں بہم شرارتیں کیں اور حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہوئی کہ معاہدے کے مطابق ان کو وہاں سے نکالدیا جائے تو آپ نے اعلان کیا کہ خیبر میں جس جس کا حصہ ہے وہ جا کر اپنی اپنی زمین سنبھال لے۔ ازواج مطہرات کے سامنے حضرت عمرؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ میں سے جو جو پسند کریں وہ اتنی زمین لیلیں جس کی پیداوار اسی قدر ہو جسقدر غلہ اور ثمرہ آپ کو نبی صلعم کے زمانہ سے ملتا آرہا ہے اور جو چاہیں اپنے حصہ کی زمین حکومت کے انتظام میں رہنے دیں اور اتنا ہی غلہ اور ثمرہ حکومت سے لیتی رہیں۔ اس تجویز کے مطابق بعض ازواج مطہرات نے غلہ اور ثمرہ پسند کیا اور حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما نے زمین لیلی اس کے بعد حضرت عمرؓ نے یہودیوں کو خیبر سے منتقل کر کے تیما اور اریحا میں بسا دیا۔ (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

یہ عہد نبوت و خلافت کے مشہور ترین واقعات میں سے ہے اور اسکی صحت میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں صریح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ نبی صلعم نے خود بٹائی پر زمین کاشت کیلئے دی ہے اپنی طرف سے بھی حکومت کی طرف سے بھی اور ان پندرہ سو افراد کی طرف سے جن کا حصہ خیبر میں تھا اس طریقہ پر آپ اپنے آخری لمحۂ حیات تک عامل رہے اور آپ کے بعد خلفین کا عمل بھی اسی پر رہا۔ کیا اس کے بعد بھی کسی کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اسلامی قانون میں بٹائی پر زمین کاشت کیلئے دینا ممنوع تھا؟ (مسئلہ ملکیت زمین)

امیر جماعت اسلامی کی اس دلیرانہ جسارت پر ہم کیا کہیں؟ انھیں شاید معلوم ہو کہ یہی واقعہ خیبر ہے جس سے لفظ مخابرہ بنایا گیا ہے۔ مخابرہ[1] کے معنی ہوتے ہیں خیبر جیسا معاملہ کرنا۔ اس سے پہلے خود مودودی صاحب صحاح ستہ کے حوالوں سے حضرت زید بن ثابت، جابر ابن عبداللہ، رافع ابن خدیجؓ کی روایتوں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک نقل کر چکے ہیں کہ "نھی رسول اللہ صلعم عن المخابرہ" جس کا ترجمہ ہوا "رسول اللہ صلعم نے خیبر جیسا معاملہ کرنے سے منع فرمایا ہے"۔ یہ روایات متعدد صحیح سندوں سے متعدد صحابہ سے خود صحیحین تک میں موجود ہیں۔ ان روایات میں مخابرہ کا لفظ خود بتلا رہا ہے کہ خیبر کا یہ واقعہ اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا اور اس معاملہ ہی کے پیش نظر عربی زبان میں اسی واقعہ سے ایک لفظ بھی وضع کیا جا چکا تھا جو عام طور سے مستعمل تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ لفظ بھی بتا رہا کہ خیبر کے معاملہ کی حیثیت کچھ اور تھی۔ وہ بٹائی پر بندوبست کرنا نہیں تھا ورنہ مخابرہ کے اس نئے لفظ کو استعمال کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی جبکہ عربی زبان میں متعدد دوسرے بہت سے الفاظ پہلے سے موجود تھے۔ رسول اللہ صلعم شاید سمجھتے ہونگے کہ میرے بعد امت میں ایسے ایسے "عالم" بھی پیدا ہونگے جو اسی ایک واقعہ کو نظیر بنا کر امت میں جاگیرداری و زمینداری کو فروغ دینگے۔ انہی لوگوں کے استدلال کی جڑیں کاٹنے کیلئے آپ نے صاف طور پر خیبر کا نام لیکر ممانعت فرمائی کہ خیبر جیسا معاملہ تم دوسری جگہ پر نہ کر بیٹھنا کیونکہ اس کی حیثیت مزارعت کی نہیں ہے بلکہ قطعاً دوسری ہے۔ ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں کہ خیبر کے معاملہ کی وہ دوسری حیثیت کیا تھی۔ ہو سکتا ہے کہ

---

[1] اگر مودودی صاحب کو خود اس کا علم نہیں تھا تو کم از کم ترجمان القرآن (ص ۱۶۵) جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۵۰ء میں حکیم صدیقی (مرحوم) کا یہ فٹ نوٹ ہی ملاحظہ فرما لیا ہوتا جس میں وہ لکھتے ہیں "مخابرہ کا لفظ خیبر ہی سے لیا گیا ہے اور اس سے معاملہ خیبر مراد لیا جاتا ہے اور بعد میں یہ لفظ مزارعت (بٹائی) کا مرادف بن گیا ہے" صدیقی

تاریخ سے اس دوسری حیثیت کا علم بھی ہمیں حاصل ہو جائے جیسا کہ ذرا آگے چل کر قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ (اور ہو سکتا ہے کہ ہم اسے یقینی طور پر معلوم نہ بھی کر سکیں) لیکن جب متعدد سندوں کے ساتھ خود صحاح میں رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد موجود ہے کہ "خیبر جیسا معاملہ کرنے سے آپ نے ممانعت فرمائی" تو اس واقعہ کو بطور دلیل و استنباط کے پیش کرنا دیدہ دلیری نہیں اور کیا ہے۔ پھر یہ کہ اس معاملہ کی وہ دوسری حیثیت بھی ایسی مخفی نہیں ہے جو معلوم نہ ہو سکے۔ ابوبکر رازی نے شرح مختصر الطحاوی میں اس کا نشان بھی دیدیا ہے وہ فرماتے ہیں:-

آنحضرت صلعم نے کھجوروں اور زمین کی پیداوار کے نصف کی جو شرط عائد کی تھی وہ جزیہ کے طور پر تھی اور اسکی دلیل یہ ہے کہ تاریخ میں یہ کہیں موجود نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے اس کے علاوہ کوئی جزیہ لیا ہو یہاں تک کہ آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور ابوبکرؓ و عمرؓ نے بھی نہیں لیا حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے ان کو جلاوطن کر دیا۔ اگر یہ جزیہ نہ ہوتا تو آیت جزیہ کے نزول کے بعد ان سے ضرور جزیہ لیا جاتا۔ (بحوالہ عینی شرح بخاری ص۴۲۴)

اس کے جواب میں مودودی صاحب کا یہ ارشاد قطعاً قابل التفات نہیں کہ

جو لوگ کہتے ہیں کہ خیبر کا معاملہ بٹائی کا نہیں بلکہ جزیہ کا معاملہ تھا صحیح نہیں ہے اسلئے کہ قرآن مجید میں جزیہ کے احکام غزوۂ خیبر کے ڈھائی تین سال بعد آئے ہیں اور یہ کہیں سے ثابت نہیں ہے کہ حضورؐ نے سورۂ توبہ کی آیت جزیہ کے نزول سے پہلے کسی ذمی پر جزیہ لگایا ہو۔ (مسئلہ ملکیت زمین ص۴۹)

امام رازی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ بعینہٖ جزیہ ہی تھا۔ وہ صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ جزیہ کے طور پر کوئی ٹیکس تھا۔ جزیہ کی آیت اگر خیبر کے ڈھائی تین سال بعد بھی نازل ہوئی ہو تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ اس آیت سے پہلے اس قسم کا کوئی ٹیکس لگانے کی ممانعت تھی۔ کیا رسول اللہ صلعم کو اپنے اجتہاد سے کچھ کرنے کی ممانعت تھی۔ کیا نماز کی فرضیت سے پہلے (جو بقول مقلدین روایات شب معراج میں فرض ہوئی) آپ نماز جیسی کوئی عبادت نہیں کرتے تھے؟ کیا رمضان کی فرضیت سے پہلے (جو ۲ھ میں ہوئی ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزے نہیں رکھتے تھے اور مسلمانوں سے روزے نہیں رکھواتے تھے؟ کیا زکوٰۃ کی فرضیت سے پہلے چندہ کے طور پر ہی سہی مسلمانوں سے کچھ بھی نہیں لیا جاتا تھا؟ کیا سورۂ انفال کے نازل ہونے سے پہلے جس میں اموال غنیمت کو حلال کیا گیا ہے رسول اللہ صلعم نے جنگ بدر کا مال غنیمت خود تقسیم نہیں فرمایا تھا؟ کیا فدیہ کے جواز نازل ہونے سے پہلے ہی رسول اللہ صلعم نے بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینا منظور نہیں فرما لیا تھا؟ اس قسم کی مثالیں کہاں تک گنائی جائیں۔ افسوس ہے کہ ان لوگوں نے رسول کی حیثیت یہ سمجھی ہے کہ وہ ریڈیو کی ایک مشین ہوتا ہے۔ اُدھر سے بولنے والا بولتا ہے تو یہ بھی بول اٹھتا ہے ورنہ اسے خاموش و معطل ہی رہنا پڑتا ہے۔ مودودی صاحب کو خود تو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مزاج اسلام کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد فرما سکیں مگر اللہ کے رسول کی حیثیت اتنی بھی نہیں ہے۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

ہمیں مودودی صاحب پر حیرت ہے کہ وہ رسول اللہ صلعم سے اس امر کو تو مستبعد سمجھتے ہیں کہ آپ اپنے اجتہاد سے کوئی ایسا امر اختیار فرما سکیں جس کے مطابق آئندہ وحی آجانے والی ہو مگر اس امر کو مستبعد نہیں سمجھتے کہ وحی آجانے اور ایک حکم مل جانے کے بعد بھی آپ اس کی تعمیل نہ فرمائیں۔ مودودی صاحب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا کہ اگر معاملہ خیبر درحقیقت معاملہ مزارعت ہی تھا تو رسول اللہ صلعم نے اور آپ کے بعد شیخین رضی اللہ عنہما نے یہود خیبر پر آیت جزیہ نازل ہو جانے کے بعد جزیہ کیوں نہیں لگایا۔ ہمارے نزدیک پہلی صورت اس دوسری ناروا صورت سے کہیں بہتر ہے اور امام رازی کا مذکورہ بالا خیال قرین صواب ہے۔

اس کے باوجود ہمیں اس پر بھی اصرار نہیں ہے کہ یہ جزیہ ہی کا معاملہ تھا یا کچھ اور تھا لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ اس کی کچھ دوسری حیثیت تھی جس کی وجہ سے رسول اللہ صلعم نے خاص طور پر تنبیہ فرما دیا تھا کہ خیبر جیسا معاملہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے بعد آپ یہ بھی دیکھئے کہ خیبر کی جو زمینیں فتح ہوئی تھیں یہ صرف آٹھ قلعوں پر مشتمل تھیں۔ ناعم۔ قموص۔ شق۔ نطاۃ۔ کتیبہ۔ وطیح۔ سلالم۔ اور حصن الصعب بن معاذ جس میں سے تین قلعے کتیبہ، وطیح

اور سلام مملکت کی ملکیت قرار پائے۔ کتیبہ بحیثیت خمس غنیمت کے اور وطیح وسلالم بحیثیت مال فئے کے۔ باقی پانچ قلعے اٹھارہ سو سہام پر بانٹ کر پندرہ سو آدمیوں میں تقسیم کئے گئے۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ ان کا رقبہ تھا اور کتنے لوگ اس میں شریک ہوئے اور ہر شخص کے حصہ میں کتنی کتنی زمین آئی ہوگی۔

یہاں تک کی تفصیلات سے آپ نے دیکھ لیا کہ رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں لوگوں کے پاس دو قسم کی زمینیں تھیں۔

(۱) وہ زمینیں جو اسلام لانے سے پہلے سے لوگوں کے قبضہ میں چلی آرہی تھیں۔

(۲) جو بعد میں ضرورت کے لحاظ سے مرکز ملت کی طرف سے ضرورت مند مسلمانوں کو عطا ہوئیں۔

(۳) پہلی قسم کی زمینیں زیادہ تر اتنی ہی تھیں جو بمشکل اپنے قابض لوگوں کی ضروریات کو کافی ہو سکتی تھیں۔

(۴) صرف بنو حارثہ کے پاس ضرورت سے زیادہ زمینیں موجود تھیں اور وہ اپنی زمینیں بٹائی پر دینے کے عادی تھے۔

(۵) بٹائی پر زمینیں دینے کے سسٹم کو رسول اللہ صلعم نے قطعاً بند فرما دیا اور حکم دیا کہ جس کے پاس فاضل زمینیں ہوں وہ اپنے دوسرے بھائیوں کو بخش دیں۔

(۶) حضرات صحابہ کی اطاعت و فرمانبرداری کو دیکھتے ہوئے یہ شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ صحابہ نے اس پر عمل نہیں فرمایا ہوگا۔ اس لئے ایسا یقین کر لینے میں کوئی مانع نہیں ہے کہ ضرورت سے زیادہ زمینیں ضرورت مندوں کو فوراً دیدی گئی ہوں گی۔

(۷) جن لوگوں کے پاس زمینیں تھیں وہ خود ہی ان میں کام کرتے تھے۔

(۸) مرکز ملت کی طرف سے جن لوگوں کو زمینیں دی گئی تھیں وہ بھی خود ہی ان میں کام کرتے تھے۔ ان کو بٹائی پر نہیں دے سکتے تھے۔

(۹) خیبر کی زمینیں مسلمانوں میں تقسیم کردی گئی تھیں اور وہ اپنی مقدار کے لحاظ سے ضرورت سے زیادہ نہ تھیں۔

(۱۰) خیبر کی زمینیں وہاں کے یہودی باشندوں کو مرکز ملت کی طرف سے بٹائی پر دی گئی تھیں مگر یہ معاملہ بٹائی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ خراج یا جزیہ وغیرہ کا کوئی معاملہ تھا۔

(۱۱) چونکہ خیبر کے اس معاملہ سے شبہ ہو سکتا تھا اسلئے رسول اللہ صلعم نے صراحت کے ساتھ صحابہ کو خیبر جیسا معاملہ کرنے کی ممانعت فرما دی تھی۔

اب اس کے بعد آپ یہ دیکھئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جن لوگوں کے پاس یہ زمینیں تھیں ان کی حیثیت کیا تھی؟ وہ ان پر بحیثیت کاشتکار کے قابض تھے یا بحیثیت مالک کے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ یہ زمینیں افراد ملت کی ملکیت متصور ہوتی تھیں یا مرکز ملت کی؟

اصولی طور پر ہم یہ چیز پہلے وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ زمین تو زمین اسلام کسی قسم کی چیز میں بھی انفرادی ملکیت کو عینی ملکیت کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا۔ وہ انتفاع اور استفادہ کے لئے افراد کی تحویل میں وکالتی حیثیت سے اموال دے دینے میں مضائقہ نہیں سمجھتا مگر ملکیت بہرحال جماعت ہی کی رہتی ہے زمین بھی اصولی طور پر اس سے خارج نہیں ہے لیکن خصوصی طور پر زمین کے متعلق بھی ہمیں اس قسم کے اشارات ملتے ہیں جن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ یہ زمینیں جو ان افراد کی تحویل میں تھیں وہ مرکز ملت ہی کی ملکیت متصور ہوتی تھیں نہ کہ افراد کی۔

(۱) عہد نبوی اور عہد شیخین میں قابل کاشت زمینوں کی خرید و فروخت کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت تک اس بیع و فروخت کو ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں یعنی سنہ ۳۰ھ میں اسکی اجازت دیدی چنانچہ ابن جریر طبری (قدیم ترین مورخ) نے اس امر کو حضرت عثمانؓ کے مباح کر دینے سے تعبیر کیا ہے۔ (یہ بحث تفصیل کے ساتھ آگے آرہی ہے)۔

(۲) جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ زمینیں تھیں ان کو رسول اللہ صلعم نے تین باتوں کا اختیار دیا تھا۔ رافع ابن خدیجؓ کی یہ روایت پہلے گذر چکی ہے جس میں رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے۔

جس کے پاس اپنی ضرورت کے زیادہ زمین ہو تو وہ خود ہی کاشت کرے۔ یا اپنے کسی بھائی کو بخشدے، یا اپنی زمین کو یونہی پڑا رہنے دے۔

تیسرا اختیار تو محض تہدیدی نوعیت کا ہے اصل میں دو ہی اختیار تھے یا وہ خود کاشت کریں یا اپنے کسی بھائی کو بخش دیں۔ اگر زمینوں کی بیع و فروخت بھی مشروع ہوتی تو تیسرا تہدیدی پہلو اختیار کرنے کے بجائے سیدھی بات یہ تھی کہ یوں کہا جاتا کہ وہ دوسرے کسی بھائی کو قیمتاً فروخت کر دیں، یہ صورت زیادہ سہل، آسان اور قابل قبول ہو سکتی تھی مگر اس صورت کا اختیار نہیں دیا گیا۔

(۳) رسول اللہ صلعم اور عہدِ شیخین میں مملکت کا قانون یہ تھا کہ جو شخص تین سال تک اپنی زمین کو بیکار و معطل چھوڑے رکھے، حکومت اس زمین کو واپس لے لے اور کسی دوسرے آدمی کے حوالہ کر دے چنانچہ علامہ ابن عبید لکھتے ہیں۔

ایک صحابی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین عطا کی تھی لیکن وہ اس کو آباد نہ رکھ سکے۔ اس وجہ سے حضرت عمرؓ نے یہ زمین ان سے واپس لی اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دی۔ (کتاب الاموال لابن عبید صفحہ ۲۹۰)

ایسے ہی

مزنیہ یا جہنیہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ زمین دی تھی اور انھوں نے اس کو بیکار ڈالے رکھا۔ اس کے بعد کچھ دوسرے لوگوں نے اس میں کاشت شروع کر دی۔ حضرت عمرؓ کے سامنے یہ جھگڑا پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اگر یہ زمین میری یا صدیق اکبرؓ کی دی ہوئی ہوتی تو میں اسکو ضرور واپس لے لیتا لیکن یہ زمین رسول اللہ صلعم کی عطا فرمودہ ہے۔ اس موقعہ پر حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ بہر حال اس بارہ میں قانون یہی ہے کہ من عطل ارضا ثلث سنین لم یعمرھا فجاء غیرہ فعمرھا فھی لہ۔ جو شخص کسی زمین کو تین سال تک بیکار چھوڑے رکھے اور اس کے بعد دوسرا شخص آکر اس کو آباد کرے تو یہ زمین اس آباد کرنے والے کی ہو جائے گی۔ (بحوالہ عینی شرح بخاری)

(۴) ۳۰ھ کے لگ بھگ حضرت عثمان بن عفانؓ نے مسلمانوں کو زمینوں کی خرید و فروخت کی اجازت دیدی اور یہیں سے اس سلسلہ کی ابتدا ہوئی۔ چنانچہ علامہ سید قطب لکھتے ہیں۔

عثمانؓ آئے۔ انھوں نے حضرت عمرؓ کے دونوں ارادوں کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت جمع ہو گئی تھی اسکو واپس نہیں لیا۔ اور وظائف و عطایا اُسی تفاوت و امتیاز کیساتھ باقی رکھے (جو حضرت عمرؓ کے زمانے سے چلے آ رہے تھے) اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ حضرت عثمانؓ نے عطایا میں اور بھی وسعت کر دی چنانچہ دولتمندوں کی دولت میں اور اضافہ ہو گیا اور ضرورتمند لوگوں کی تنگی بسا اوقات بڑھتی چلی گئی اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے ان ہی دولتمندوں کو بڑے بڑے انعامات عطایا سے بھی نوازا پھر قریش کو اسکی اجازت دیدی کہ وہ دوسرے ممالک میں جہاں جانا چاہیں جا سکتے ہیں۔ اور ان کے جو مال بیکار پڑے ہوئے ہیں انھیں تجارتوں میں لگا سکتے ہیں۔ اس سے ان کی دولتمندیاں کئی گنا زیادہ بڑھ گئیں۔ سب سے آخر میں آپ نے ان مالداروں کیلئے یہ بھی مباح کر دیا کہ وہ سواد اور غیر سواد میں زمینیں اور مکانات خرید سکتے ہیں۔ اس کے بعد بتدریج ایک جاگیرداریت کا نظام اجتماع اسلامی پر چھاتا چلا گیا حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ کے آخری زمانہ میں اسی کی حکومت رہ گئی۔ (العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام صفحہ ۲۰۵)

اسی موضوع پر علامہ طٰہٰ حسین الفتنۃ الکبریٰ میں رقمطراز ہیں:۔

اسوقت سے حضرت عثمانؓ نے محسوس کر لیا تھا کہ لوگوں کی حالتیں بدل چکی ہیں اور فتنہ ظاہر ہونے لگا ہے اور اس فتنہ سے امکانی حد تک احتیاط برتنا ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے مدینہ میں لوگوں کو خطبہ دیا اور اس کے متعلق جو کچھ ان کو معلوم تھا لوگوں کو بتلایا اور فتنہ سے ڈرایا اور سعید بن العاصؓ کو سیاسی سیرت کے متعلق جو کچھ وہ ہدایات دینا چاہتے تھے ان کے متعلق لوگوں سے مشورہ کیا چنانچہ سب نے ان کی رائے کی تائید کی لیکن حضرت عثمانؓ نے ایک بڑی ہی خطرناک بات ایجاد کی جسکی نظیر موجود نہیں تھی۔ مدینہ والوں نے جونہی اسے سُنا وہ بڑے ہی مسرور ہوئے اور اس پر انھوں نے بڑی خوشیاں منائیں حضرت عثمانؓ کا خیال تھا کہ جو فساد معاشرہ میں

پیدا ہوگیا ہے اس طرح وہ اسکی اصلاح کر سکیں گے۔ لیکن اس ایجاد نے ان کی توقعات کے بالکل ہی برعکس نتائج پیدا کئے۔ ان کی اختراع یہ تھی کہ سوائے ان لوگوں کے جن کا کسی خاص شہر میں رہنا مملکت کے تقاضے کیلئے ضروری ہو (اور ظاہر ہے کہ اس ضمن میں فوجی یقیناً شامل تھے) باقی لوگ جس جگہ قیام کرنا چاہیں چلے جائیں۔ ان کا حصہ وہیں منتقل کر دیا جائیگا ـــــ مدینہ والوں نے جب حضرت عثمانؓ کی اس نئی اختراع کو سُنا تو وہ پہلے حیرت و دہشت کے ملے جلے جذبات سے ان کا منہ تکتے رہ گئے۔ وہ کہنے لگے جو زمینیں بطور فے کے خدا نے ہمیں دی ہیں انہیں آپ جہاں ہم قیام کرنا چاہیں کس طرح منتقل کر دینگے؟ ـــ حضرت عثمانؓ نے فرمایا ـــ یہی اس اختراع کا مغز تھا ـــ ہم ان زمینوں کو فروخت کر دیتے ہیں۔ جس شخص کی زمین حجاز میں ہو اس کے برابر میں جو شخص چاہے دوسرے شہروں کی زمینیں ہم سے خرید لے۔ مدینہ والے نہایت خوش ہوئے کہ خدا نے ان پر ایک ایسا دروازہ کھولدیا جو اُن کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ چنانچہ لوگ منتشر ہوگئے کہ خدا نے اس ذریعہ سے ان کیلئے اور فراخی کا سامان بہم پہنچا دیا ہے۔ (بحوالہ الطبری واقعات ۳۰ھ)

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اولاً اہلِ حجاز پر یہ چیز پیش کی پھر اسکو تمام بلادِ عرب کیلئے عام کر دیا کہ جن لوگوں کی زمینیں عراق یا دوسرے ممالک میں ہوں وہ ان کے بدلے حجاز وغیرہ میں زمینیں خرید لیں۔ لوگ ایسا کرنے سے اپنے اپنے شہروں میں مقیم ہو جائیں گے اور ان کے ساتھ ان کے بیوی بچے اور غلام اور لونڈیاں بھی وہیں منتقل ہو جائینگی اور مختلف شہروں میں شور و شر ہلکا پڑ جائیگا۔ اور اعرابی لوگ ان شہروں کی طرف ہجرت کرنا کم کر دینگے اور جو لوگ بلادِ حجاز و عرب میں اس قسم کی زمینیں خریدینگے انہیں کام کرنیوالوں کی بھی کافی ضرورت ہوگی تاکہ ان زمینوں کی غور و پرداخت کی جاسکے۔ لہٰذا غلام اور موالی کثیر مقدار میں بلادِ عرب میں آجائینگے اور مختلف شہروں میں ان جنگی قیدیوں کی وجہ سے جو بلا انقطاع چلے ہی آرہے ہیں شور کم ہو جائیگا۔

لوگ اگر اس ایجاد و اختراع پر خوش ہوئے ہوں تو کوئی تعجب نہیں کیونکہ حجاز والوں کو حجاز کی سرزمین عراق سے کہیں زیادہ محبوب تھی۔ اسی طرح یمن والوں کو یمن کی سرزمین شام اور مصر سے زیادہ مرغوب تھی انھوں نے اسے غنیمت سمجھا کہ وہ دور دراز کے ممالک سے منتقل ہو کر اپنے گھروں میں واپس آجائینگے۔ ان کی زمینیں ان کے پاس ہونگی جن کی دیکھ بھال وہ بغیر کسی کلفت و مشقت کے کر سکیں گے۔ نہ انہیں طویل و قصیر سفر کرنا پڑے گا اور نہ آباؤ اجداد کی سرزمین سے ہجرت کرنی پڑیگی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے تمام ممالک میں اس تجویز کے مطابق احکام بھیجدیئے جس نے لوگوں پر ایک ایسا بڑا دروازہ کھولدیا جس کے اثرات ان کی حیات سیاسی و اجتماعی و اقتصادی اور عقلی میں بہت ہی دور رس تھے۔

ہم یہاں چند مثالیں بیان کرتے ہیں: کبار صحابہؓ میں سے ایک جماعت ایسی موجود تھی جس کے پاس پہلے ہی حجاز میں دولت کی کوئی کمی نہیں تھی ان کے پاس یہاں زمینیں بھی تھیں اور نقد صورت میں بھی بہت کچھ تھا۔ ان لوگوں نے فوراً اپنی اس بے پایاں دولت سے مختلف شہروں میں بڑی بڑی جائدادیں خرید لیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سرزمین حجاز کے بجائے ان شہروں کی زمینیں زیادہ زرخیز ہیں چنانچہ طلحہ ابن عبید اللہ نے بڑی جانفشانی اور دوڑ دھوپ کر کے اولاً خیبر کے وہ تمام حصے جو فاتحین خیبر کو رسول اللہ صلعم نے عطا فرمائے تھے خرید لئے اور جب حضرت عثمانؓ نے یہ دروازہ کھولدیا تو یہ تمام حصے فروخت کر کے حجاز والوں سے ان کے حصے عراق میں خرید لئے جن کو وہاں کچھ زمینیں ملی ہوئی تھیں اسکے بعد بھی ان کے پاس نقد مال کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس تمام مال سے انھوں نے عراق میں بڑی وسیع زمینیں خرید ڈالیں۔ حتیٰ کہ خود حضرت عثمانؓ کی عراقی زمینوں سے انھوں نے اپنی حجازی زمینوں کا تبادلہ کر لیا۔ باقی لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ لہٰذا جس نے سرزمینِ حجاز سے ہجرت کرنا گوارہ نہ کی تو اپنی زمینیں فروخت کر کے کہیں قریب زمینیں خرید لیں اس کا پہلا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ عراق وغیرہ ملکوں میں بڑی بڑی زمینداریاں قائم ہوگئیں۔ اس اختراع سے صرف وہی لوگ نفع اٹھا سکتے تھے جن کے پاس بڑے بڑے اموال تھے اور جو چھوٹی چھوٹی زمینوں والوں سے ان کی زمینیں خرید سکتے تھے چنانچہ طلحہ، زبیر، مروان ابن الحکم نے بے اندازہ زمینیں خرید ڈالیں اور اس سال بیع و فروخت قرض۔ تبادلہ اور مضاربت کی وجہ سے بے اندازہ دولت کی ریل پیل ہوگئی۔ پھر یہ چیز حجاز و عراق ہی تک

محدود نہیں رہی بلکہ ایک جہت سے تمام بلاد عرب بلکہ تمام ممالک مفتوحہ تک پھیل گئی اور ہر طرف بڑی بڑی جاگیرداریاں اور وسیع و عریض زمینداریاں قائم ہوگئیں۔ پھر دوسری طرف ان زمینوں کے انتظام اور غور و پرداخت کیلئے غلاموں اور موالیوں اور ملازموں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ اور اس طرح اسلام میں ایک نئے طبقہ نے جو بلوتقراطیہ (Proletariat طبقہ کہلاتا ہے) جنم لے لیا۔ جو ارسٹقراطیت (Aristocracy) کا ایک لازمی جزو ہے۔ یہ طبقہ مالی کی کثرت اور ثروت کی عظمت اور خدم و حشم کی زیادتی ہی سے ہمیشہ پیدا ہوا کرتا ہے (الفتنۃ الکبریٰ ۔ عثمانؓ۔ طٰہٰ حسین ص ۱۰۳-۱۰۵)

ہم نے یہ طویل اقتباس اسلئے دیدیا ہے کہ واقعہ کے تمام پہلو نگاہ کے سامنے آجائیں۔ بہر حال مذکورہ بالا تصریحات سے یہ امور منقح ہو کر آپ کے سامنے آگئے۔

(۱) حضرت عثمانؓ سے پہلے عہد نبویؐ اور عہد شیخینؓ میں زمینوں کی خرید و فروخت نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کو مباح نہیں سمجھا جاتا تھا۔

(۲) امام طبریؒ کی تصریحات کے مطابق حضرت عثمانؓ نے سنہ ۳۰ھ میں یہ ایک اختراع فرمائی تھی کہ زمینوں کی خرید و فروخت کو مباح قرار دیدیا تھا۔

نوٹ: اختراع اور مباح قرار دینا کے الفاظ خاص طور پر قابل لحاظ ہیں۔

(۳) اس سے پہلے جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ زمینیں ہوتی تھیں وہ ان سے واپس لیکر دوسرے ضرورت مند لوگوں کو دلوادی جاتی تھیں جس کا کوئی معاوضہ ان کو نہیں دیا یا دلوایا جاتا تھا۔

(۴) اگر کوئی شخص زمین کو تین سال تک معطل ڈالے رکھتا تھا تو اس سے واپس لیکر وہ زمین دوسرے ضرورتمندوں کو دیدی جاتی تھی۔

ان امور کی روشنی میں آپ خود ہی اندازہ لگالیجئے کہ صورت حالات کیا تھی۔ کیا جن لوگوں کے قبضہ میں یہ زمینیں تھیں وہ آپ کو ان کے مالک نظر آتے ہیں یا کاشتکار۔ اگر یہ مالک تھے تو

(I) حضرت عثمانؓ کے عہد تک زمینوں کی خرید و فروخت کیوں نہیں ہوتی تھی؟

(II) پھر ضرورت سے زیادہ زمینیں بلا معاوضہ دوسرے ضرورتمندوں کو کیوں اور کس طرح دلوادی جاتی تھیں؟

(III) معطل چھوڑ دینے کی صورت میں بھی تین سال کی مقررہ حد کے بعد ان قابضین سے زمینوں کو کیوں واپس لے لیا جاتا تھا اور دوسرے ضرورت مند لوگوں کو کس طرح حوالہ کردی جاتی تھیں؟

یہ امور صاف غمازی کر رہے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے عہد تک زمینیں خود مملکت کی ملکیت ہوا کرتی تھیں۔ افراد کی ملکیت نہیں ہوتی تھیں۔ سب سے پہلے حضرت عثمانؓ نے اس کو جائز قرار دیا۔ ہمیں اس[1] سے بحث نہیں ہے کہ انھوں نے کن حالات میں یہ تبدیلی کی تھی اور اس تبدیلی میں وہ کہاں تک حق بجانب تھے۔ بلکہ ہمیں یہاں صرف اس امر سے گفتگو کرنی ہے کہ مسلمانوں میں سنہ ۳۰ھ تک زمینداری اور جاگیرداری کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس کی ابتداء حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے ہوئی ہے اور جب ایک دفعہ یہ دروازہ کھل گیا تو پھر اس سیلاب کو کوئی نہ روک سکا تا آنکہ پوری کی پوری ملت اس کے اندر ڈوب گئی۔

یہ تھی مسلمانوں میں زمینداری کی ابتداء ـــــ تاریخ کی روشنی میں۔

اس مضمون کی آئندہ قسط میں ہم بتائیں گے کہ مسلمانوں میں ملوکیت اور ملائیت نے کس طرح جنم لیا۔ ہماری تاریخ اس بارہ میں کیا رہنمائی کرتی ہے۔ دوسری قسط کے لئے مئی کے پرچہ کا انتظار فرمایئے۔

---

[1] حضرات خلفائے راشدین کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے دانستہ اسلام کے خلاف کچھ کیا ہوگا۔ نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے اپنے زمانے کے کن تقاضوں کے پیش نظر ایسا کیا تھا لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دین نہیں بنایا جاسکتا۔ خیال رہے کہ یہ ایک تاریخی بیان ہے۔ اور تاریخ دین میں حجت نہیں ہوتی۔ بہت ممکن ہے کہ یہ تاریخی بیان سرے سے غلط ہو اور حضرت عثمانؓ نے ایسا نہ کیا ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

اعجاز القرآن

جلد اول

من الفقیر الی ربہ الباری

تمنا العمادی المجیبی الفلوروی

المہاجر

کان لہ ربہ فی الاول والآخر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وبہ نستعین

الحمد للہ رب العلمین وسلام علی المرسلین لاسیما علی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے آج تک ہر فرد مسلم جو قرآن مجید سے کسی حد تک بھی واقف ہے اور یہ ایمان رکھتا ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے، وہ اس عقیدے کا معتقد اور اس دعوے کا مدعی ضرور رہا اور رہے، اور قیامت تک ہر مسلم کا یہ عقیدہ اور یہ دعویٰ رہے گا کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ ایک ایسا پائیدار، ناقابلِ انکار کھلا اور روشن معجزہ ہے جس کی مثال دنیا پیش نہیں کر سکتی۔ سارے عالم کے تمام جن وانس بھی چاہیں کہ سب مل کر اس کی مثال بنا کر پیش کریں تو نہیں کر سکتے۔ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ بڑے بڑے فصحا وبلغا نے ایسا کرنا چاہا مگر ان کو اپنی ناکامی اور اپنی سعی کی ہیچ انجامی کا اعتراف کرنا پڑا۔

قرآن مجید کے ایسے روشن معجزہ ہونے کا دعوےٰ نہ صرف مسلمانوں کو ہے بلکہ خود قرآن مجید نے بآوازِ بلند اس کی تحدی کی اور تمام منکرین کو ببانگ دہل اس کی مثال پیش کرنے کا چیلنج دیا اور بار بار چیلنج دیا مگر منکرین کی دنیا اس چیلنج کے متعلق ایسی شہر خموشاں بنی رہی کہ صدائے برنخواست۔ سورۂ ہود میں ہے:۔

ام یقولون افترٰہ قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریٰت وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین ٭ فالم یستجیبوا لکم فاعلموا انما انزل بعلم اللہ وان لا الٰہ الا ھو ٭ فھل انتم مسلمون ٭ ( )

کیا یہ منکرین کہتے ہیں کہ رسول نے (اپنی طرف سے یہ آیتیں بنا کر اللہ تعالیٰ پر) ان کا افترا کیا ہے؟ کہہ دو تو ایسی ہی افترائی دس سورتیں تم (بھی) بنا کر لاؤ اور اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو بھی پکار سکو پکار دو (اور اس کام میں اس کی مدد حاصل کرو) اگر تم (اس الزام افترا میں) سچے ہو تو جب یہ منکرین تمہارے اس چیلنج کو قبول نہ کریں (اور گریز کریں) تو اے مسلمانو! سمجھ لو کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے علم سے نازل ہوئی ہے اور اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں، تو پھر تم تو مسلمان ہونا؟

یہ کھلا ہوا چیلنج جب کفار ومشرکین عرب کے پاس پہنچا تو وہ بہت گھبرائے کیونکہ قرآن مجید کی معجزانہ فصاحت وبلاغت کا سکہ ان کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا مگر اپنی دلی خفت مٹانے کے لئے ہٹ دھرمی کے ساتھ یوں بول گئے تھے کہ قد سمعنا لو نشاء لقلنا مثل ھذا ( ) (ہاں ہم نے سنا، اگر ہم بھی چاہتے تو ایسا کہہ دیتے) اگر چاہتے تو ایسا کہہ دیتے مگر چونکہ چاہتے نہیں ہیں اس لئے نہیں کہتے ہیں۔ کیسی صریح ہٹ دھرمی کا جواب ہے۔ اس کھلے چیلنج کے بعد بھی اگر نہیں چاہتے تو کب چاہتے۔ اور ان کی رگِ غیرت میں کب جوش آتا۔

اس ہٹ دھرمی کے جواب کا یوں جواب دیا گیا: قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا ( ) کہہ دو اے رسول (کہ تم کیا ہو) اگر تمام جن و انس اس بات کیلئے مجتمع ہوں کہ اس قرآن کی مثال بنا کر لائیں، تو اس کی مثال نہیں لا سکتے، اگرچہ بعض بعض کے مددگار ہو جائیں۔

اس کے بعد پھر دوبارہ اس پہلے چیلنج کو اور پُرزور کر کے یوں پیش کیا گیا: ام یقولون افترٰہ قل فاتوا بسورۃ مثلہ وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین ( ) (یہ منکرین ابھی تک یہ کہتے ہیں کہ اس کتاب کو رسول نے اپنی طرف سے بنا کر اللہ تعالیٰ پر افترا کیا ہے؟ کہہ دو کہ نے آؤ ایسا ایک سورہ بھی (بنا کر) اور اللہ کے سوا جن کو بھی (اپنی مدد کیلئے) پکار سکو پکارو اگر تم سچے ہو۔ فبھت الذی کفر تو پھر یہ سنکر ہر منکر مبہوت ہو کر رہ گیا اور کچھ جواب نہ چلا۔

فاتحۃ الکتاب یعنی سورہ فاتحہ جو قرآن کا مقدمہ یعنی دیباچہ ہے اس کے بعد پہلے پہل جو سورۃ آپ کے سامنے آتا ہے اس کی پہلی آیت قرآن مبین کا ایک بہت بڑا دعویٰ ہے۔ فرمایا گیا: ذٰلک الکتٰب لا ریب فیہ (یہ کتاب اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں) ھدی للمتقین (متقی) تقویٰ والوں کے لئے سامان ہدایت ہے، تقویٰ والے کون ہیں اس کو اسی قرآن میں بتا دیا گیا ہے: والذی جاء بالصدق وصدق بہ اولٰئک ھم المتقون ( ) (جو شخص سچائی لے کر آیا اور سچائی کے سچائی ہونے کو مان کر اس کا اعتراف اس نے کیا ایسے ہی لوگ متقی ہیں) اور ان کے برعکس ہٹ دھرم ہیں یعنی ہٹ دھرم وہ ہے جو سچی بات کو سچی بات تسلیم جانتے ہوئے بھی اس کا انکار کرے اور کبھی اس کو تسلیم نہ کرے، تو جو شخص ہٹ دھرم ہوگا اس کو قرآن سے کبھی کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ وہ تو مانتے ہی نہیں، ہاں جو شخص سمجھا ہوا اور سچی بات مان لیتا ہو بس وہی قرآنی ہدایات سے مستفیض ہو سکتا ہے۔

قرآن کو تین جماعتوں سے سابقہ پڑا ایک جماعت متقین کی جو سچ سچے اور سچی بات مان لینے والے تھے، یہی لوگ چونکہ ایسے تھے جو قرآن مجید سے فائدہ ہدایت اٹھا سکتے تھے اور قرآن درحقیقت انھیں کے لئے نازل ہوا، اس لئے سب سے پہلے انھیں کا ذکر کیا گیا۔ چونکہ ایسے لوگ کچھ اہل کتاب میں بھی تھے۔ اور کچھ امیوں میں بھی یعنی جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہ تھی۔ اس لئے ان دونوں جماعتوں کے متقین کا ذکر یوں فرمایا گیا کہ پہلے "الذین" سے امیین کے اہل تقویٰ اور پھر "والذین" سے اہل کتاب کے اہل تقویٰ کی تصریح کرتے ہوئے دونوں جماعتوں کے متقین کے متعلق فرمایا گیا کہ۔

اولٰئک علیٰ ھدی من ربھم واولٰئک ھم المفلحون ( )

یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

متقین کے بعد ان کی ضد یعنی ہٹ دھرموں کا ذکر کیا یعنی دوسری جماعت جس سے قرآن کو سابقہ پڑا وہ ان ہٹ دھرموں کی جماعت ہے جنھوں نے انکار ہی کی ٹھان لی ہے، ان کو نتیجہ کفر سے ڈرایا جائے یا نہ ڈرایا جائے وہ کبھی ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اس جماعت کا حکم یوں بیان فرمایا گیا کہ

ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ ولھم عذاب عظیم ( )

اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔

تیسری جماعت جس سے قرآن کو سابقہ پڑا وہ منافقین کی جماعت ہے۔ ان کا حال بیان کر کے ان کا حکم بیان فرمایا گیا کہ

اولئک الذین اشتروا الضلالۃ بالھدیٰ فما ربحت تجارتھم وما کانوا مھتدین ( )

یعنی یہ وہ ہیں جنھوں نے گمراہی کو ہدایت دیکر خرید لیا۔ مگر انکی یہ تجارت ان کیلئے سودمند نہ ہوئی اور یہ (سچے) ہدایت یافتوں کے ساتھ گھلے ملے رہنے کے باوجود) ہدایت یافتہ نہ ہوئے۔

پھر ان منافقین کے مناسب حال دو مثالیں دیکر سمجھایا اور یہ مضامین پہلے ہی سورہ یعنی سورۂ بقرہ کے پہلے ہی دو رکوع میں دوسرے مضامین سے پہلے بیان فرمائے گئے۔ تیسرے رکوع میں پورے عالم انسانیت کو مخاطب کر کے ان کو صرف اپنے رب کے بندے بنے رہنے اور شرک سے بچنے کی طرف دعوت دی گئی، جو قرآن کی اصل ہدایت ہے۔ اس کے بعد ہی ہٹ دھرموں پر اتمام حجت کے لئے ایک زبردست تحدی کی جاتی ہے یعنی منکرین اور مذبذبین کو ایک کھلا چیلنج دیا جاتا ہے کہ

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداءکم من دون اللہ ان کنتم صدقین فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ اعدت للکافرین ۔

اور اے لوگو! اگر تم کسی شک میں ہو اس چیز کے بارے میں جس کو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو ایسا ایک سورہ بھی بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو پکار لو اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو (یعنی ایک سورہ بھی ایسا بنا کر نہ لا سکو) اور کبھی نہ کر سکو گے تو پھر اس آگ سے ڈرو جس کے ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے جو کافروں کے لئے مہیا رکھی ہے۔

شروع میں دعویٰ کیا کہ یہ کتاب لاریب فیہ ہے، اس میں ریب و شک کی گنجائش ہی نہیں۔ یہاں اتمام حجت کے لئے فرمایا ہے کہ تم کو اس کتاب میں کچھ شک ہو تو ایسا ایک سورہ بھی بنا کر لاؤ۔ پھر یہ بھی پیشین گوئی خود ہی فرما دی کہ تم ایسا کوئی سورہ کبھی بنا کر نہ لا سکو گے اتنا بڑا زبردست چیلنج وہ بھی بالکل غیر مشروط تقریباً پونے چودہ سو برس سے آج تک آسمان کے گنبد گرداں میں ہر ہر طرف گونج رہا ہے مگر اس وقت سے اس وقت تک تمام منکرین و مذبذبین سر مہ در گلو مبہوت و خموش ہی رہے جیسے کسی کے منہ میں زبان ہی نہیں۔ کیا اس کتاب کی لاریبیت اور منجانب اللہیت کے لئے ایسے زبردست اتمام حجت کے بعد بھی کسی مزید حجت طلبی کی گنجائش باقی ہے؟

یہ لاریبیت اس کے تمام دعووں کی صداقت سے متعلق ہے، اس لئے کہ اس کتاب کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ کتاب منزل من اللہ ہے، حق ہے، رحمت ہے، اور تمام عالم کے لئے سامان ہدایت ہے۔ اگرچہ نفع بخش۔ یہ متقین ہی کے لئے ہے مگر ہٹ دھرم منکرین اور مذبذب و شک کے مبتلاؤں کے حق میں اتمام حجت ہے۔ اس کی ہر تعلیم ساری دنیا کے لئے باعث ترقیات دنیوی و فلاح اخروی ہے۔ اس کتاب کی تعلیم سے روگرداں رہ کر کوئی شخص، کوئی قوم، کبھی صحیح کامیابی نہیں حاصل کر سکتی۔ غرض قرآن کا ہر دعویٰ لاریب فیہ ہے، اس کی ہر تعلیم، ہر عبارت، ہر جملہ بلکہ ہر حرکت بلکہ ہر حرکت، و سکون لاریب فیہ ہے۔

دنیا کا کوئی صاحب عقل و ہوش اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

قرآن کا ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ اس میں لفظاً و معنیً کسی طرح کا اختلاف نہیں:

ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً (۴/۸۲)

اگر یہ کتاب اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو لوگ اس میں بہت سے اختلاف پاتے۔

ظاہر ہے کہ جو کتاب ۲۳ برس میں تھوڑا تھوڑا کر کے مختلف احوال اور مختلف ماحول میں لوگوں کے سامنے آئے اور اس میں کبھی کسی طرح کا ردو بدل نہ ہو۔ ضروری ہے کہ مختلف زمانوں اور مختلف ماحول کی وجہ سے اگر کوئی انسان اس کا مصنف ہوتا تو متضاد باتیں بولنے پر مجبور ہوتا کیونکہ آئندہ کا علم کسی انسان کو نہیں جو اس کی رعایت رکھتے ہوئے بولا کرے۔ مگر اللہ تعالیٰ تو عالم الغیب ہے ابتدا ہی سے یکساں انداز بیان رکھا۔ مسلمانوں کے ضعف و مظلومیت کے زمانے میں بھی قرآن کا لب و لہجہ کبھی کمزور نہ رہا۔ غرض قرآن میں دعوئے عدم اختلاف بھی اپنی لاریبیت کی ایک خاص شان رکھتا ہے۔

قرآن کی فصاحت و بلاغت ہی قرآن کا اصلی اعجاز نہیں

قرآن کی فصاحت و بلاغت جس طرح معجزانہ ہے اسی طرح قرآن کی ہر تعلیم معجزانہ ہے، ہر طرز بیان معجزانہ ہے۔ قرآن کے امثال معجزانہ ہیں، غرض قرآن مجید کی ہر چیز ایک نہ ایک عنوان ضرور رکھتی ہے۔ اس لئے معیار اعجاز کے لئے صرف اس کی فصاحت و بلاغت کو پیش کرنا در اصل قرآن کی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

قرآن کا اعجاز کیسا ہونا چاہئے

قرآن کے مخاطب عہد نبوی سے لیکر قیامت تک کے سارے جن و انس ہیں۔ یہ کتاب تمام عالم کیلئے ہدایت ہے اس لئے اس کتاب کو تمام عالم کے لئے معجزہ ثابت ہونا چاہئے۔ صرف اس کی فصاحت و بلاغت کے اعجاز کو اہل عرب ہی سمجھ سکتے ہیں یا وہ عجمی جو ادب عربی سے پوری طرح واقف ہوں۔ اس کی سیاسی تعلیمات کے اعجاز کو ماہرین سیاست ہی بھانپ سکتے ہیں، اس کی قانونی و آئینی ہدایات کی معجزیت کو قانون داں حضرات ہی جان سکتے ہیں۔ اس کی نفسیاتی معجزانہ عنوان موعظت و انداز بیان کو فلسفیان نفسیات ہی تاڑ سکتے ہیں اور اس کے سراپا اعجاز تعلیم حکمت و تزکیۂ نفس کا اعتراف نفس زکیہ والے حکماء ہی کو ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس میں کوئی بات ایسی بھی ضرور ہونی چاہئے جو بلا تفریق طبقات و قبائل و بلا امتیاز امیال و عواطف ہر دور میں ہر انسان پر اس کتاب کا اعجاز کر ایسی وضاحت و ہدایت کے ساتھ ثابت کرتی رہے جس سے کسی سچے شخص کو انکار ممکن نہ ہو اور پھر وہی بات قرآن کا اصلی اعجاز سمجھی جائے گی۔

قرآن کا اصلی اعجاز

قرآن کا اصلی اعجاز اس کی لاریبیت ہے یعنی کوئی صاحب عقل و ہوش بھی اگر وہ سچا آدمی ہے اور سچی بات کی سچائی کا اعتراف دیانت کے ساتھ کرنے کا خوگر ہے تو اس کتاب کے حالات و مضامین کو دیکھ یا سن کر وہ مجبور ہوگا کہ بغیر کسی ریب و شک کے اس کتاب کو منزل من اللہ، اس کی آیتوں کو کلام اللہ اور جن پر یہ کتاب اتری ان کو رسول اللہ، بلا چون و چرا تسلیم کر لے اور یہی اس کتاب کا اصلی اعجاز ہے۔

فرق امیال وعواطف

یہ ہوسکتا ہے کہ ایک فصیح وبلیغ عربی زبان کا ادیب، قرآن کی فصاحت وبلاغت کی معجزانہ شان دیکھکر اس پر ایمان لے آئے، ایک حکیم اس کی تعلیم حکمت وتزکیہ نفس کا اعجاز سمجھ لینے کے بعد اس کی لاریبیت کا اعتراف کرلے، ایک قانون داں اس کے قانونی ہدایات کی معجزنما استواریوں کو دیکھکر بے اختیار کہہ اٹھے کہ ذٰلک الکتاب لاریب فیہ۔ مگر ایک عامی جو کسی فن، کسی علم میں کوئی دستگاہ نہیں رکھتا ہے۔ اس کتاب کے اعجاز کو کس طرح محسوس کرے گا؟ خصوصاً جب یہ کتاب اس کو بھی مجبور کر رہی ہے کہ تم مجھ کو معجز مانو۔

فرق ادوار وعہود

یہ بھی بخوبی ممکن ہے کہ مختلف زمانوں میں اختلاف ماحول کی وجہ سے یا اختلاف عواطف ہی کے باعث، اُن تمام وجوہ اعجاز میں سے ایک ہی دو وجہ لوگوں کے سامنے ہو، اور اس وقت تک دوسرے وجوہ پر لوگوں کی نظریں نہیں پڑی ہوں، یا پڑی ہوں مگر اچٹتی سی، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اگلے دوروں میں وہ وجہ پیدا ہی نہ ہوئی ہو، اور بعض دور میں وہ وجہ اپنے ابتدائی مراحل میں ہو، اور اپنی عدم تکمیل کی وجہ سے اسوقت تک اعجاز کا ثبوت نہ سمجھی جا سکتی ہو۔

غرض قرآن کا اصل اعجاز اس کی لاریبیت ہے، چاہے جو شخص یا جماعت یا جس دور یا جس زمانے کے لوگ جس وجہ سے بھی اس کی لاریبیت کا اعتراف کریں۔ اعتراف کے وجوہ واسباب میں فرق ہوگا۔ اور ضرور ہوگا مگر اعتراف لاریبیت ہر زمانے اور ہر دور میں ہر جماعت اور ہر شخص کے لئے یکساں ہی رہے گا۔ عہد نبوی سے لیکر خلافت بنی عباس کے ابتدائی دور تک تو قرآن مبین کا کھلا ہوا اعجاز عموماً اس کی فصاحت وبلاغت ہی سمجھی جاتی رہی۔ مومنین اس کی حکمت وموعظت کی دلکشی اور اس کے آئین وقوانین کی استواری ہمواری کو بھی ضرور سمجھتے تھے مگر منکروں اور ہٹ دھرموں کے سامنے اس کے معجزانہ انداز بیان اور اس کی فصاحت وبلاغت ہی کو وہ پیش کرتے رہے۔ چونکہ یہ ایک ایسی چیز تھی کہ کوئی کیسا ہی ہٹ دھرم ہو، اگر وہ عربی ادب سے باخبر ہے تو اس کو قرآن مبین کی اس آفتاب سے زیادہ روشن صفت کے آگے سرنگوں ہو جانا ہی پڑتا تھا اور آج بھی سرنگوں ہو جانا ہی پڑتا ہے۔ مصر وبیروت اور عراق کے اکثر اطراف میں یہود ونصاریٰ ماہرین ادب عربی ہیں، یورپ کے علمائے مستشرقین میں جن کو ادب عربی کی اچھی مہارت حاصل ہے۔ آج بھی ان کا ہر فرد قرآن مجید کی فصاحت وبلاغت کا معترف ہے۔ زبان سے وہ اس کی فصاحت وبلاغت کو بجا اعجاز نہ مانے اور اس کے اعجاز کا اعتراف واقرار نہ کرے مگر ہر ایک کا دل ضرور اس کی شہادت دیتا ہے اور بعض وقت ان کی زبان وقلم سے بھی اشارۃً ہی سہی مگر اس کا اظہار ہو جاتا ہے۔

مگر جیسے جیسے دنیا میں علوم وفنون کی ترقی ہوتی گئی، اس کتاب کے اور دوسرے وجوہ اعجاز بھی اہل نظر کے سامنے آتے گئے، لیکن چونکہ اس کے معجزانہ انداز بیان، اس کی معجزانہ فصاحت وبلاغت کا غلغلہ عہد نبوی سے بلند چلا آرہا ہے اور ہر زمانے میں بلند رہا اور اس کے طرز بیان، حتیٰ کہ تناسب الفاظ وحسن ادا ومترنمانہ تلفظ میں ایسی معجزنما دلکشی ہے کہ عربی سمجھنے والے ہی نہیں، بلکہ اگر کوئی خوش آواز قاری اس کی کچھ آیتیں پڑھتا ہے تو جو شخص ایک حرف بھی عربی نہیں جانتا، وہ بھی سن کر جھومنے لگتا ہے۔ اور میرا یہ ذاتی مشاہدہ ہے کہ رونے لگتا ہے۔ اس لئے باوجود اس کے کہ اس کتاب کے دوسرے وجوہ

اعجاز بھی اہلِ نظر کے سامنے آگئے تھے، اس کی فصاحت وبلاغت کے نقارخانے میں ان طوطیوں کے چہچہے کی طرف زیادہ کان نہیں دیئے گئے اور اہلِ نظر نے بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی، کہ خواہ مخواہ دوسرے وجوہ کو بھی نمایاں کرکے ان کا بھی نقارہ پیٹا جائے۔ غرض تھی اعجازِ قرآن کے ثابت ہونے سے اور وہ ساری دنیا پر ایک وجہ کے اعتبار سے مسلّم ہو چکا ہے، تو پھر دوسرے وجوہ کو پیش کرکے منکروں کے سامنے ایک نیا موضوع بحث کیوں چھیڑا جائے۔

موجودہ زمانہ اِس زمانے میں دنیا کی اکثریت عربی زبان اور اس کے ادب سے بالکل بے بہرہ ہے۔ یہانتک کہ عربی ملکوں بلکہ مکہ اور مدینے میں بھی اب عام لوگوں کی زبان وہ قرآنی عربی نہ رہی۔ ادب عربی پر مصر و بیروت و دمشق وغیرہ میں عیسائی عرب نے وہ اثر ڈالا ہے کہ جدید عربی میں فصاحت وبلاغت کا معیار بھی بدلا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے نئے پودوں کی خود فراموشی و خود فروشی اور اغیار پرستی ہر جگہ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ مسلم نوجوانانِ عرب بھی عیسائی عربی ادیبوں کے ساتھ ساتھ قرآنی عربی ادب اور طرزِ نگارش کو چھوڑ کر جدید رنگ جو عیسائی عربوں کا پیدا کردہ ہے اسی کو اختیار کرتے جا رہے ہیں، اسی لئے قرآنی فصاحت وبلاغت سے وہ ناآشنا سے ہوتے جا رہے ہیں۔ اور دور پڑتے جا رہے ہیں۔ اور عرب کے عوام تو قرآنی عربی سے اس قدر دور پڑ گئے ہیں کہ اب انھیں لفظی ترجمہ سمجھنا بھی مشکل سا ہو گیا ہے۔ تو پھر وہ فصاحت و بلاغت کو کیا سمجھیں گے۔ مدارس عربیہ میں ادب عربی کی تعلیم جہاں بھی ہے وہاں معلمین اور طلبہ کو جتنی دلچسپی مقامات بدیعی و حریری و زمخشری سے یا سبعہ معلقہ و حماسہ و دیوان متنبی و ابی العتاہیہ سے ہے اتنی دلچسپی بھی انھیں قرآن مبین سے نہیں۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ علماء عرب بھی تدبر فی القرآن کی توفیق سے محروم ہی نظر آتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ جو حضرات قرآن پر نگاہ غور بھی ڈالتے ہیں تو یورپ کی عینک لگا کر۔ ان کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ یورپ کے فلسفے اور سائنس کی تحقیقات کو قرآنی آیات سے ثابت کیا جائے اور اس طرح قرآن کا ایک نیا اعجاز دنیا کو دکھایا جائے کہ دیکھو جو نئے نئے ایجادات آج یورپ نے نکالے ہیں آج سے پونے چودہ سو برس پہلے قرآن مبین ان کی طرف اشارے کر چکا ہے۔ اور فلاں فلاں آیت سے فلاں فلاں تحقیق جدید اس اس طرح قرآن مبین کی فلاں فلاں آیتوں سے صاف اور واضح طور سے نکل رہی ہے۔

وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی یہ دماغ سوزی نہ قرآن کے لئے مفید نہ اسلام کے لئے۔ عوام مسلمانوں کے لئے محض دل خوشکن ہو تو ہو مگر قرآن اور اسلام کی تبلیغی اسپرٹ کے لئے سخت مضر، اور اہلِ نظر، حکمائے اسلام کے لئے شرمندگی کا باعث ہے اس لئے کہ ان کی ان لفاظیوں کو دیکھکر اہلِ یورپ یہ کہہ سکتے ہیں بلکہ کہتے ہوں گے کہ تمہاری کتاب میں یہ فلسفہ و سائنس پہلے سے موجود تھا۔ ان تحقیقات اور ان ایجادات کے متعلق قبل سے اشارے موجود تھے مگر تمہیں اور تمہارے اسلاف کو کبھی نہ سوجھے۔ باوجود اس کے کہ تمہارے ہر طبقہ کے لوگ ہمیشہ اس کتاب کو پڑھتے پڑھاتے رہے۔ تلاوت و حفظ میں سرگرم رہے مگر یہ حقائق کبھی کسی کو نظر نہ آئے۔ اور ہم لوگ بغیر آپ کی کتاب پڑھے خود بخود ان حقائق کو جان گئے اور اس فلسفہ و سائنس سے واقف ہی نہیں ہوئے، بلکہ ان میں ماہر ہو گئے۔ اس لئے آپ لوگوں کو اس کتاب کی ضرورت

ہو تو ہو۔ ہم لوگوں کو تو اس کی مطلق ضرورت نہیں۔ بلکہ آپ لوگوں کے لئے بھی یہ کتاب بیکار ہی ہے۔ اس لئے کہ آپ کو بھی جو ہمارے ایجادات اور ہمارے بتلائے ہوئے فلسفے اور سائنس اس کتاب میں نظر آنے لگے تو ہمارے ایجاد و اختراع کے بعد اور ہماری تصنیفات کو پڑھ کر اور اس پر بھی آپ ابھی تک ہم سے پڑھنے اور سیکھنے کے بعد بھی اپنی کتاب کی مدد سے کوئی نئی چیز نہیں نکال سکتے بلکہ ہماری چیزوں کی نقل تک نہیں اتار سکتے۔ کیا ہمارے مفکرین کے پاس اس کا کوئی جواب ہے؟

مرحوم علامہ طنطاوی نے جو ایک عمر گذار کر اتنی لمبی چوڑی تفسیر لکھی اور قرآن مبین کو ایک بساط بنا کر اس پر یورپ کے فلسفے اور سائنس کے جواہر ریزے لا لا کر بکھیر کر رکھ دیئے ہیں، ان کا مطالعہ اہل یورپ کے لئے تحصیل حاصل ہے اور مسلمانوں کے لئے سعی لا حاصل ہے۔ اس لئے کہ اس تفسیر کو پڑھ کر کوئی شخص نہ قرآن مبین ہی کو صحیح طور سے سمجھ سکتا ہے نہ فلسفہ و سائنس ہی کا ماہر ہو سکتا ہے۔ جتنا وقت ایک پڑھنے والا اس تفسیر کی ضخیم متعدد جلدوں میں صرف کر کے بے ترتیب اور منتشر مضامین فلسفہ و سائنس کے معلوم کر سکے گا اس سے کہیں کم وقت میں ابواب و فصول کے ماتحت مرتب مضامین کسی فلسفے یا سائنس کی کتاب کو دیکھ کر ذہن نشین کر لے سکتا ہے۔ غرض اس تفسیر سے فلسفہ و سائنس کے محض سطحی معلومات، وہ بھی بالکل منتشر معلوم ہو سکتے ہیں کوئی ایک فلسفہ بھی اپنے سارے جزئیات مسائل کے ساتھ معلوم نہیں ہو سکتا اور نہ نفس تفسیر کے متعلق کوئی نئی بات دوسری تفسیروں سے فاضل معلوم ہو سکتی۔ جس کو فلسفہ و سائنس دیکھنا ہوگا وہ فلسفہ و سائنس کی کتابیں دیکھے گا نہ کہ تفسیر طنطاوی۔ اور جس کو ادب عربی کے اعتبار سے نفس تفسیر دیکھنا ہوگا تو وہ زمخشری کی کشاف دیکھے گا جس کو فقہا کے اختلافات و دلائل کی تصریحات چاہئیں وہ تفسیر کبیر وغیرہ سے کام نکال لے گا۔

کاش علامہ طنطاوی اور ان جیسے دوسرے مصنفین و مفکرین، یورپ کی بساط پر قرآنی جواہرات بکھیر کر یورپ کے بازار میں وہاں کے اہلِ نظر کے سامنے پیش فرماتے اور انھیں قرآنی و اسلامی جواہرات سے آشنا کرتے تو یہ اہلِ یورپ کے لئے بھی مفید ہوتا اور اس کا تبلیغی مقصد بھی پورا ہوتا اور قرآن و اسلام دونوں کی خدمات کا حق بھی ادا ہوتا۔

(باقی آئندہ)